اردو ادب میں

فنِ سوانح نگاری کا ارتقاء

الطاف فاطمہ

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس سوئیوالان دہلی ۲

اردو میں

فن سوانح نگاری

کا

ارتقا

از

آنسہ الطاف فاطمہ ایم۔ اے

پہلا ایڈیشن مئی ۱۹۷۸ء

کتابت حبیب الرحمٰن

قیمت ۲۰/- روپے

(نیو لیتھو آرٹ پریس)

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی

فہرست مضامین

مقدمہ

پہلا باب

دوسرا باب
اردو سوانح نگاری حالی سے پہلے

تیسرا باب
حالی اور اُن کا فن سوانح نگاری

چوتھا باب
شبلی اور اُنکا فن سوانح نگاری

پانچواں باب
عہدِ سرسید کے دوسرے اہم سوانح نگار

چھٹا باب
اردو سوانح نگاری — حالی و شبلی کے بعد

ساتواں باب
آپ بیتیاں

پہلا باب

۱۔ فن سوانح نگاری اور اس کی مختصر سرگذشت

۲۔ مغرب میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء

۳۔ مشرق میں فن سوانح نگاری کا تصور اور اس کی مختلف شاخیں۔

مقدمہ

اردو میں سوانح عمریاں اور اس فن کی مختلف اصناف کثرت سے لکھی گئی ہیں۔ لیکن اس فن کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے۔ میں نے جس وقت اپنے مقالے کے لئے اس موضوع کو منتخب کیا تو مجھ کو اس امر کا علم نہ تھا کہ اس موضوع یعنی "اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا" پر کوئی باضابطہ کام اب تک ہوا ہی نہیں۔ بہر حال لاعلمی بھی اچھی چیز ہے۔ اگر مجھ کو اس موضوع کی وسعت کا اور اس کے بارے میں خاطر خواہ تنقیدی مواد کے فقدان کا علم ہوتا تو شاید اس موضوع میں کشش محسوس کرنے کے باوجود اس کے انتخاب کی ہمت نہ ہوتی۔

جب مجھے اس موضوع پر کام کرنے کی اجازت مل گئی تو مجھ کو احساس ہوا کہ یہ بہت لمبا اور محنت طلب موضوع ہے اور جس کسی نے بھی میرے موضوع کا نام سنا مجھے ہمدردانہ مشورہ دیا کہ یہ بہت سا کام ہے ایک بار پھر غور کرو لیکن مجھے نہ جانے کیوں شروع سے اپنی ذات سے زیادہ اپنے محترم استاد ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی رہنمائی پر کامل یقین ہو گیا تھا اور

میں نے اس بارے میں غور کرنے کی چنداں ضرورت نہ سمجھی۔

محنت اور دقت طلب کون سا کام نہیں ہوتا۔ چنانچہ میرا یہ کام بھی خاصہ لمبا اور محنت طلب تھا۔ سب سے زیادہ یہ کہ اس میں ہاتھ ڈالنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اس میں خاصہ الجھاؤ ہے۔ تاریخ تذکرہ سوانح کی کتابیں کسی خاص ترتیب میں نہیں۔ ہر جگہ خواہ فہرست میں دیکھ لیجئے خواہ الماریاں کہیں جگہ سلسلہ سے نہیں ملیں گی۔ حالانکہ سوانح نگاری کی بعض اصناف مثلاً مناقب تذکرے یادگار وغیرہ کے ماتحت بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں اور سیرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سوانح، تو بذات خود ایک وسیع اور جداگانہ موضوع ہے جس پر باقاعدہ ایک جداگانہ مقالہ تیار ہو سکتا ہے۔ باقاعدہ کام شروع کرنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے مجھے اردو کی ان تمام کتب کی فہرست تیار کرنے کا حکم دیا جو اس فن سے تعلق رکھتی تھیں۔ جن میں یہ عناصر پائے جاتے تھے اور اس کام نے مجھے جتنا پریشان کیا پورے مقالے نے نہیں کیا۔ سارا سارا دن بیٹھ کر یہ فہرست نقل کی اور تیار کی۔ یونیورسٹی لائبریری اور پبلک لائبریری کی فہرستوں سے مجھے کافی مدد ملی۔ لیکن مجھے کامل یقین ہے، کہ اب بھی بے شمار کتابیں نقل ہونے سے رہ گئی ہوں گی۔ اس کام میں دماغ سے تو کام لینا تھا۔ نہیں لیا۔ بس قلم چلتا رہتا تھا۔ اس لئے برابر الجھن ہوتی رہتی تھی کہ کاغذ اور وقت ضائع ہو رہا ہے۔ بہرحال فہرست تیار ہوئی

اور ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کے بموجب ان کو سوانح نگاری کی مختلف اصناف کے ماتحت ترتیب دیا اور جونہی فہرست مرتب ہوگئی اور اس کو غور سے دیکھا تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کے ضبط و ترتیب میں آتے ہی موضوع کی گتھیاں خود بخود کھل گئیں اچھے لکھنے والے خود بخود الگ نظر آنے لگے۔ سوانح عمری کی مختلف اصناف کا واضح تصور بھی ہوگیا اور مختلف دور بھی نظر آنے لگے اور کام شروع ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی انتہائی مصروفیتوں کے باوجود میری رہنمائی فرمائی ان کی شفقت کا شکریہ ادا کرنا میرے نزدیک گستاخی ہے اسی طرح میں اپنے محترم پروفیسر ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی صاحب کا شکریہ ادا نہیں کرسکتی، جنھوں نے مجھے فہرست مخطوطات اردو کا اپنا ذاتی نسخہ ایسے وقت میں دیکھنے کے لئے دیا جب وہ مجھے تلاش کے باوجود کہیں نہیں مل رہا تھا اور چند مفید مشورے بھی دئے۔

مجھے افسوس ہے کہ بعض مصنفین جن کا میں نے ذکر کیا ہے ان کی تصانیف باوجود تلاش کرنے کے مجھے نہ مل سکیں اور ان پر اظہار رائے نہ ہوسکا۔ اس کے علاوہ مجھے اس موضوع پر حالی اور شبلی کی سوانح نگاریوں کے علاوہ کسی دوسرے مصنف کی بابت، نقادوں اور اہل قلم حضرات کی آراء نہ مل سکیں۔ اس لئے مجھے یہ اپنا حق معلوم ہوا کہ خود اپنے تاثرات اور رائے کو آزادانہ استعمال کروں۔

مجھے اس امر کا احساس ہے اور اس کا اعتراف بھی ہے کہ بعض مواقع پر اس مقالے میں بے ربطی اور انتشار بھی نظر آتا ہے۔ اکثر کتب کے حوالے دیتے وقت صفحات کے نمبر بھی نہیں دے سکی ہوں اور میں اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکی۔ جس کا سبب یہ ہے کہ میں اس دوران میں سخت پریشان۔ ذہنی انتشار اور عدیم الفرصتی کا شکار رہی اور مجھ کو ایک ایسے صدمۂ عظیم سے دوچار ہونا پڑا جس کا ذکر بھی میرے لئے محال ہے۔ یہ موضوع انتہائی دلچسپ اور توجہ طلب تھا کہ اس کو ختم کرتے وقت مجھکو خیال آرہا ہے کہ کاش مجھے سکون قلب اور فرصت میسر ہوتی اور میں نے اس کو خاطر خواہ طور پر انجام دیا ہوتا بہر حال جو کچھ ہو گیا ہے اسی پر تعجب ہے۔ آخر میں مجھے رضیہ جہاں آرا صاحبہ لکچرر اسلامیہ کالج فار ویمن کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اپنے قیمتی مقالے شبلی کی سیرت نگاری سے استفادہ اٹھانے کا موقع دیا میں یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ اردو کے لائبریرین صاحب اور اپنے اورنٹیل کالج کے لائبریرین صاحب کی مشکور ہوں جنھیں میں نے اس سلسلہ میں بہت پریشان کیا ہے

جاتا ہے کی طویل اور پُر ورانتوں میں نانی اماں یا دادی اماں
کی سنائی ہوئی کہانی میں ایک منزل ایسی بھی آتی ہے کہ مصائب اور
اچانک حادثات کا شکار شاہزادہ مایوسی کی حالت میں جوگ لے کر
کسی سنسان جنگل میں درخت تلے رات گزارتا ہے اور درخت پر بیٹھی
ہوئی مینا طوطے سے بات کرنے کی فرمائش کرتی ہے اور طوطا پوچھتا
ہے آپ بیتی کہوں یا جگ بیتی؟ تو مینا ٹھنڈا سانس لے کر کہتی ہے
آپ بیتی تو روز کی ہے جگ بیتی کہو تو رات کٹے۔ اور جگ بیتی میں
مایوس و دلگیر شاہزادہ اپنے لئے ایک نیا راستہ ایک نئی منزل
پالیتا ہے۔ اور از سرِ نو مصائب کا مقابلہ کرنے پہ آمادہ ہو جاتا
ہے۔ بالکل اسی طرح زندگی کی موجوں میں گھرا ہوا انسان بعض
وقت دوسروں کی داستانِ حیات سے اپنے اندر روحِ عمل کو
بیدار کر لیتا ہے۔

جگ بیتی سے فائدہ اٹھانا اور دلچسپی لینا انسان کا فطری جذبہ ہے کسی کی کامرانیوں اور ناکامیوں کی سرگزشت بڑی ہی دلچسپ معلوم ہوتی ہے انسان خواہ کتنا ہی مشغول ہو لیکن دوسروں کے بارے میں کچھ جاننے کا جذبہ اس کے اندر ہمیشہ کروٹیں لیتا ہی رہتا ہے۔ ہمیں جس قدر اپنی ذات سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اسی قدر دوسرے کے حالات جاننے کے مشتاق ہوتے ہیں ان کی زندگیوں کے سربستہ رازوں کو کریدتے ہیں اور ان انکشافات کی روشنی میں اپنی راہوں کا تعین کرتے ہیں دوسروں کی کمزوریاں اور خامیاں دریافت کر کے ایک تسکین سی محسوس کرتے ہیں ہم ان کے کارناموں کو مشعل راہ بناتے ہیں۔ ان راہوں پر بے دھڑک گامزن ہو جاتے ہیں جن کے ذریعہ انھوں نے کامیابی کی منزلیں طے کی تھیں ان کی لغزشوں کی کٹھن ڈگر پہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے گزرتے ہیں اور ان کے دکھ سکھ میں اپنے درد کا مداوا ڈھونڈتے ہیں

یہی وجہ ہے کہ انسان کو یاد رفتگاں ہمیشہ سے عزیز رہی ہے اپنے بزرگوں اور اگلوں کے کارنامے کو جمع کرنے اور یاد رکھنے کا دستور آج سے نہیں قدیم الایام سے چلا آرہا ہے۔ یہاں تک کہ جب انسان پڑھنے اور لکھنے کے نام سے بھی آشنا نہ تھا۔ اس وقت بھی اپنے اچھوں اور دوسروں کے بڑوں کے داستانیں سینوں میں محفوظ کرتی جاتی تھیں اور انسان اپنے خاندانوں اور قبیلوں کے قابل ذکر کارناموں کو لوک گیتوں اور قصے کہانیوں کی شکل میں نسلاً بعد نسلاً سینہ بہ سینہ

سونپتا چلا گیا۔ رجزیہ اشعار، مرثیہ اور قصائد اسی سلسلے کی ترقی یافتہ کڑیاں ہیں۔ لوک گیتوں اور قصہ گوئی کے بعد تحریری سوانح عمریاں ظہور میں آئیں۔

جب انسان نے تحریر کو ذریعۂ اظہار کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا ہوگا تو سب سے پہلے انھی خاص جذبات کی ترجمانی کی ضرورت پیش آئی ہوگی جو اسے عزیز تر ہوں گے اور یہ اس کے عزیز و اقربا کی یاد اپنے قابلِ ذکر مشاہیر اور ان کے خاص خاص کارناموں کی یاد کو محفوظ کر لینے کی خواہش ہی ہوگی چنانچہ اس وقت کے تاریخی ماخذ پتھر اور مٹی کی سلوں پر کندہ نقوش جو اکثر ناقابل فہم ہیں ان کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بھی افراد کے حالات اور کارنامے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ قابل یقین چیز بھوج پتر اور اہرام مصری ہیں۔ مصر اور مشرق وسطیٰ کے بادشاہوں کی قبروں اور تابوتوں میں سے ایسی سلیں اور بھوج پتر برآمد ہوئے ہیں جن پر ان کے حالات زندگی لکھے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ اہرام مصر کی اندونی دیواروں پر جو عبارات کندہ ہیں وہی سوانح نگاری کے ابتدائی نمونے کہے جا سکتے ہیں

دراصل باضابطہ سوانح عمریاں لکھنے کا رواج سب سے پہلے یہودیوں کے یہاں ملتا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے قدماء کے حالات زندگی جمع کئے۔ ان کے بعد اہل روما میں رواج ہوا اور جدید تحقیق کے مطابق سب سے پہلی سوانح عمری دوسری صدی

عیسوی میں پلوٹارک نے لکھی۔ یہ ہر لحاظ سے بہترین اور بلند پایہ ہے۔

عیسائیوں کے مذہبی لٹریچر میں ان کے بزرگوں۔ مذہبی رہنماؤں اور شہیدوں کے حالات ملتے ہیں یہ حالات یادگاری حیثیت کے ہیں حالات قدرے تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ اسلئے ابتدائی نمونوں میں اہم ہیں مذہبی سوانح عمریاں دیومالاؤں اور آسمانی کتابوں سے متاثر معلوم ہوتی ہیں اور جوں جوں انسان پر مذہبیت کا غلبہ ہوتا گیا وہ مذہبی رہنماؤں اور بزرگوں کے حالات لکھتا گیا۔ جوشِ عقیدت اور محبت میں وہ صاحب سیرت کو انسانی اوصاف سے زیادہ الہٰی اور ربانی قوتوں کا مظہر بنا کر پیش کرتے تھے۔ اس قسم کے حالات عموماً قدیم معبدوں اور صحیفوں میں درج کر کے محفوظ کر دیئے جاتے تھے۔ ممکن ہے یہ رجحان آسمانی کتب کے ذریعہ پیدا ہوا ہو آسمانی کتب میں فلسفہ اخلاق کے علاوہ قوموں اور افراد کے حالات بھی بیان کئے جاتے تھے یہانتک کہ جدید ترین آسمانی کتاب قرآن مجید میں بھی شخصی حالات اور کردار واضح اور روشن طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ اور ان شخصی قصوں کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ مثلاً حضرت یوسف کا قصہ اس طرح شروع کیا گیا ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ

پھر ان کرداروں کی سیرتوں پر ان کے حالاتِ زندگی کا بڑا اثر دکھایا گیا ہے۔ حضرت عیسٰی کی زندگی شروع ہی سے مظلوم نظر آتی ہے۔ وہ ایک خاموش، مقدس اور بے کس ماں کے بچے کی صورت میں آتے ہیں جس کو دنیا والے قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ان حالات ہی میں ان کے درمند اور صلح جو مزاج کی نشو ونما ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ کا مقابلہ بطن مادر ہی سے فرعون جیسے بادشاہ سے ہوتا ہے۔ پھر وہ شاہانہ آغوش میں پرورش پاتے ہیں۔ اور ویسے ہی پر جلال اور غضبناک زود اشتعال ہٹ کے پکے تھے۔ چنانچہ ممکن ہے کہ شخصی سیرت اور کردار کا اتنا واضح تصور ان آسمانی کتب سے ہی لیا گیا ہو۔

اس طرح رفتہ رفتہ انسانی حالات اور کارناموں کے محفوظ کرنے کی یہ فطری خواہش تدریجی اور ارتقائی مراحل طے کرتی رہی اور ایک فن کی شکل اختیار کرتی رہی۔ اس کی ضرورت ہر ملک اور ہر قوم کو ہمیشہ محسوس ہوتی رہی ہے۔ اور یہ ہر جگہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے۔ اور موجودہ زمانے میں ہر قوم و ملک میں اس کا ایک عام تصور متعین ہو گیا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مصنف کا کہنا ہے کہ یہ تاریخ سے جدا صنف ادب ہے۔ یہ آرٹ ہے۔ سائنس نہیں ہے علاوہ ازیں سوانح نگار کامیاب فنکار کہے جا سکتے ہیں۔ جن کی تصنیف ہر مزاج اور زمانے کے

لوگوں کے لئے باعث تفریح و مسرت ہو سکے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو سوانح نگار ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔ فی زمانہ جبکہ دماغوں کی تخلیقی قوت کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس صنف ادب کو بجائے فن کے سائنس میں شمار کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے اور سوانح نگاری کے سائنس کا شعبہ کہنے والے بزعم خود اس کی بڑی عزت افزائی کرتے ہیں۔ درا صل یہ فن ہے جس میں سائنس کا بڑا لطیف اور نازک امتزاج ہے اس کا راستہ تلوار کی دھار سے نیز اور باریک ہے ذراسی لغزش اس کو فن کے پایہ سے گرا دیتی ہے سوانح نگار کو بڑی کٹھن راہوں اور صبر آزما پابندیوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ وہ یہ کہہ کر ادب میں بلند مقام نہیں حاصل کر سکتا کہ اس تصنیف میں کوئی خاص جدید یا اچھوتا پہلو ہے۔ اس کے لئے جانبدارانہ اور روادارانہ مصوری اور عکاسی کا کوئی موقع نہیں۔ وہ شاعر، ناول نگار نقاش اور مصوری طرح آزاد نہیں ہوتا۔ اس کو اپنے طرز نگارش میں سچائی اور دیانت داری کا بڑا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ البتہ طریق اظہار میں اس کو اجازت ہے کہ خود اپنی شخصیت اور انفرادیت کو شامل کرلے اور یہ اس کی اسلوب پر منحصر ہے۔

تفصیلات کے انتخاب میں بھی سوانح نگار کو دوسرے فنکاروں سے زیادہ حسن نظر اور سلیقہ کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ لکھنے والا کثیر المطالعہ اور وسیع المعلومات ہو۔ لیکن اس کا فرض ہے کہ وہ

ناظرین کو مواد اور تفصیلات سے پریشان خاطر نہ کر دے البتہ ...
اس کا اپنا فرض ہے کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات اور معمولی سے معمولی
واقعہ کا علم رکھے۔ مبادا کوئی ایسا اہم واقعہ چھوٹ جائے جس کا اثر
براہ راست ہیرو کے کردار اور حالات پر پڑا ہو اور لکھنے والا اس
کو نظر انداز کر دے ایک سمجھدار فنکار انہی تفصیلات کے طومار میں
سے چند انتخابات کرتا ہے اور پھر حسب ضرورت واقعات لے کر
خاکہ تیار کر لیتا ہے۔ اس سلسلہ میں Aspect of Biography
کے مصنف Maurois کا خیال ہے۔:

"سوانح نگاری میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کچھ ہم جانتے
ہیں وہ جوں کا توں پیش کر دیں اس طرح ہر شخص کی سوانح
عمری اس کے ایام حیات کی طرح طویل ہو جائے گی"

بعض وقت سوانح نگار حالات اور واقعات کے انہی پہلوؤں
کا انتخاب کر لیتا ہے جو اس کی اپنی نظر میں مستحسن اور مرغوب ہوتے
ہیں یہ طریقہ غلط ہے اس طرح سے سوانح عمری اور ہیرو کی حیثیت ایک
معمولی کی سی رہ جاتی ہے۔ اور لکھنے والے کا مطیع اور محکوم ہو کر
رہ جاتا ہے۔

حالات کی کاٹ چھانٹ میں بڑی احتیاط سے کام لیا جائے
اور زندگی کے بعض پہلوؤں کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہئے
مثلاً اس کے سراپا اور دکھا دے کی تفصیلات اس کا لب و لہجہ

اس کا طرز کلام بہت ضروری چیزیں ہیں جو اس کے مزاج اور کردار پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اپنے واقف کاروں اور کرداروں کی نشست و برخاست حرکات و سکنات کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ اس کے متعلق رائے قائم کرنے میں کوتاہی نہ ہو یہ سب اس لئے ضروری ہے کہ وہ شخصیت جس کو مصنف اپنے کاغذوں اور مسودات کے پردہ پر پیش کر رہا ہے۔ وہ ایک غیر مرئی شے بن کر رہ جاتی ہے وہ ہم کو نظر نہیں آتی اور وہ اپنی زندہ اور محسوس شخصیت کے اظہار سے قاصر ہوتی ہے۔ البتہ ہم اس کو الفاظ کے مکالموں تقریر و تحریر اور کاغذات کی بدلیوں کے پیچھے سے جھانکتا ہوا دیکھتے ہیں۔

غرض سوانح نگاری کسی فرد واحد کی شخصیت کو منظر عام پر اس طرح لانے کا نام ہے کہ اس کی فطرت اور سیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رہے اس میں لکھنے والا اپنے ذاتی جذبات کو شامل کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ ہیرو کے محاسن اور معائب کو پیش کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں اور لکھنے والے میں یہ جرأت موجود نہ ہو تو بقول جانسن ایسے موضوع کو چھوڑ دینا چاہیے۔

"When it is painful to tell the truth the story must not be told." بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کسی شخص کی زندگی کے ان واقعات کو منظر عام پر لانے سے حتی الامکان گریز کرنا چاہیے۔ جن کی شخص مذکور نے اپنی زندگی میں سختی سے

پردہ داری کی ہو کسی شخص کے ذاتی محبت ناموں کی اس کے مرنے کے بعد تشہیر کرنا کیوں کر جائز اور مستحسن ہو سکتی ہے جبکہ وہ اپنی زندگی میں انھیں کسی کو دکھانا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ ایسے لوگوں کے متعلق مسز لیسلی اسٹیفن Leslie Stephen - نے Studies of a Biographer میں یوں لکھا ہے۔

The pulication of the Brownings - correspondence naturally calls attention to troublesome a section in the code of litrary morality

اور پھر اس کا جواب بھی خود ہی دیتا ہے وہ کہتے ہیں "ایک نامعلوم خواہش اس شخص کے مزید حالات جاننے پر اکساتی رہی ہے جو ہماری دنیا ئے تخیل میں ہلچل مچا دیتا ہے۔ اور جس کے ہاتھوں میں قوموں اور نسلوں کے فکر و ذہن کی باگیں ہوتی ہیں۔"

اور واقعہ بھی یہ ہے کہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جتنا بڑا آدمی ہوگا اتنا ہی وہ اس کی فطرت کے ایسے پہلوؤں کو دیکھنے کے لئے بے چین رہے گی جو اس بڑے آدمی کو عام انسانی سطح پر لاتے ہیں۔

دراصل کسی کے اچھے یا برے اعمال کا محاسبہ کرنا اس کی پردہ داری کرنا سوانح نگار یا سیرت نگار کا فرض نہیں اس کو تو دیانت داری اور غیر جانب داری سے معلومات اور واقعات کو سلیقہ مندی اور علمی انداز میں پیش کر دینا چاہئے جو مطالعہ یا مشاہدے کے ذریعے بطور امانت اسکے حافظے اور ذہن میں محفوظ ہیں اس معاملے میں دیانت داری اور

صاف گوئی اس حد تک ضروری سمجھی جاتی ہے کہ اس کا احترام ان لوگوں کو بھی کرنا پڑتا ہے جو خود اپنی سوانح عمری لکھتے ہیں۔ ایک اچھا آپ بیتی لکھنے والا جانتا ہے کہ جو اعمال اور افعال خود اس سے سرزد ہو چکے ہیں ان کا تعلق اس کی ذات سے صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ وہ اس کے نام اور ذات سے منسوب ہیں اور اب وہ دوسروں کی امانت ہیں۔ کیونکہ دوسروں کو ان سے سبق لینا ہوتا ہے چنانچہ ایک مخلص اور فنی نظر رکھنے والا شخص کی طرح بلا خوف وخطر اپنا نامہ اعمال یہ کہہ کر پیش کر دیتا ہے کہ۔

Jhon Dunion

, my very soul may nere here be seen
Both what I was and what I should have
been dissected Thus, I stand a living
martyr grown come read my errors Sresom

اور اسی انداز کی سوانح نگاری یا سیرت نگاری سے سائنس اور آرٹ کا حسین امتزاج پیدا ہوتا ہے بہت ممکن تھا کہ راستبازی اور دیانت داری کی اتنی کڑی پابندی سے سوانح نگاری واقعات اور حالات کا ایک خشک اور بے کیف تسلسل بن کر رہ جاتی ہے اگر اس میں مصنف کو اظہار شخصیت اور اسلوب کی اجازت نہ ہوتی لیکن دوسرے علمی موضوعات کی طرح سوانح نگاری میں بھی مصنف کو پوری پوری آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنی شخصیت اور اسلوب کا اظہار کرتا

رہے۔ اس ذریعہ اظہار کے جواز کے لئے Marius نے
بڑا دلچسپ اور قابل اعتنا نکتہ نکالا ہے کہ جب سوانح نگاری
میں آرٹ کے وجود اور عنصر کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ تو پھر اس کو
ذریعہ اظہار بنانا آسان اور جائز ہے وہ کہتے ہیں۔

"فن کار کے لئے اس کے فن پارے کی سب سے
بڑی اہمیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کے لئے ایک
ذریعہ نجات بن جاتا ہے۔ دنوں اور برسوں کے
ڈھکے چھپے خیالات اور جذبات اور جو فنکار کے روح
و ذہن میں موجزن ہوتے ہیں نکاس کا رستہ پاتے
ہیں اور اس طرح وہ ایک ایسے بارِ عظیم سے
سبکدوش ہو جاتا ہے جو اس کے قلب و ذہن کو کچلتا
ہوتا ہے۔"

درحقیقت ہم ایسی کتابوں کو جو جذبات کی اس رو میں بہہ
کر لکھی جاتی ہیں دیکھ کر بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ مصنف نے اس
کے ذریعہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہا ہے ایسی صورت میں فن پارہ
تحلیل نفسی اور ایک قسم کا اقرار و اعتراف بن جاتا ہے۔ چنانچہ ہم
دیکھتے ہیں کہ چارلس ڈکنس نے مصائب اور افکار کے ہجوم کو جس
نے تمام عمر اس کو پژمردہ اور محزون رکھا تھا اتار پھینکا میریڈتھ
اور HarryRichmon نے Merudzh

Evan Harrengton کے اوراق میں جابجا اس نوع کے اعتراضات کر کے اپنے جذبات کے اُبلتے ہوئے دھارے کے بہ جانے کے لئے راہ بنا دی ہے۔ اسی طرح بچپن کی معصوم تکالیف اور بغیر کسی کی راہنمائی کے طالب علمی اور نوجوانی کی منزلیں طے کرتے وقت کی پیچیدہ الجھنوں کو عصمت چغتائی نے ٹیڑھی لکیر میں آشکار کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا اور ... غم و غصہ کا غبار نکالا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مذکورہ مصنفوں نے ان تصانیف میں محض اپنی ہی زندگی قلم بند کی ہے۔ بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کر لیا جس میں ان کو اپنے ہمدردانہ اور جذباتی کے اظہار کا بھی موقع مل جائے۔

دیکھنا یہ ہے کہ بعض اوقات ایک سوانح نگار حقیقی اور کرداروں کے ذریعہ یہ نتیجے کیوں نہیں حاصل کر سکتا جو ناول نگار حاصل کر لیتا ہے اور کیوں نہیں بائرن کی سوانح حیات سے وہ تاثر حاصل ہوتا جو Evan Harrington سے یا ٹیڑھی لکیر کے کرداروں سے ہوتا ہے بات یہ ہے کہ ایسے ناول نگار کرداروں کو تخلیق کرتے وقت انہیں زندگی کے حقیقی کرداروں کے جذبے سمو دیتے ہیں سوانح عمری کے ذریعہ اپنے دل کا غبار نکالنے کی مثال Mariqus نے خود اپنی تصنیف اور تجربے سے دی ہے مصنف نے لکھا ہے کہ جو وقت اس نے شیلے کی سوانح عمری لکھی ہے تو یہ اسکی نوجوانی اور شباب کے ان دنوں کا زمانہ تھا جنھوں نے شیلے کے نظریات اور شخصیت کو ڈھالا تھا اسکے علاوہ اسکے فلسفیانہ اندحیات و خیالات اور نظریات "شیلے" اور اسکے ہمدم و دمساز Hogg سے تھا۔

رکھتے تھے۔ پھر اس نے شیلے کی ایک مختصر سوانح حیات کا مطالعہ کیا جس میں اس کو ہر قدم پر شیلے کے جذبات خود اپنے محسوسات سے ہم آہنگ ہوتے نظر آئے۔ اس کو شیلے سے ایک جذباتی مانوسیت اور یگانگت محسوس ہوئی اور مصنف نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس وقت شیلے کی سوانح حیات لکھ کر اس کے نظریات اور خیالات کی تبلیغ و تشہیر کر کے خود اس کو ذہنی آسودگی نصیب ہوئی۔

پہلے اس نے شیلے کی داستان حیات اور Harriet اور Mary سے اس کے تعلقات کو مربوط کر کے ناول مرتب کی لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہوا اور مصنف کے اندر جو شیلے گردش لے رہا تھا وہ اسی طرح بے چین و مضطرب رہا۔ رفتہ رفتہ اس نے ان تمام حالات اور مراسلات کا جائزہ لیا جس سے اس کے مزاج اور شخصیت پر روشنی پڑتی تھی اور اس کو ذریعۂ اظہار مل ہی گیا۔ اگرچہ یہ کتاب ہر صورت سے مکمل اور جامع نہ تھی تاہم مصنف نے اس کو لکھتے وقت مسرت اور جذبے کی شدت کو محسوس کیا جو اس تصنیف میں جا بجا جھلکتی ہے یہی اظہار تاثیر اور جذبہ ہے۔ جسے ایک سوانح نگار کام میں لا کر اپنی تصنیف کو دلکش تر بنا سکتا ہے۔

لیکن ایک بات کا ہونا بہت ضروری ہے کہ موضوع اور مواد کی سطح پر جذبہ اور احساس اتنا واضح اور گہرا ہو کہ اس سے تاثر میں

شدت پیدا ہو جائے اس میں احساس کی وہ ہمہ ہمی ہو جو شدید جذبے کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔

بعض لوگ اس بارے میں یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب ٹھوس حقائق ہمارے سامنے موجود ہیں تو پھر بے سبب جذباتیت بے فائدہ لیکن دنیا کا قاعدہ یہی ہے کہ انسان کو انسان ہی کے جذبات اور خیالات کی روشنی میں جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں M. Poul Valery کی تمہید میں جو انھوں نے

Introduction a la methode de leonardo devinci

میں لکھی ہے ایک جگہ یہ کہہ کر ان تمام سوانح نگاروں کی وکالت اور تائید کی ہے جن میں ذرا بھی جذبے اور تاثر سے کام لیا گیا ہے۔

"ایک انسان کے تفکر کو ہم اپنے تفکر کے ذریعے جانچتے اور پرکھتے ہیں ہم اپنے خیالات کے آئینہ میں دوسروں کے تفکر کو بناتے سنوارتے ہیں۔"

بظاہر یہ بات صاف ہو گئی کہ ناول نگار کی طرح سوانح نگار کو بھی اظہار جذبہ کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن یہی وہ منزل اور راستہ ہے جس کو ہم تلوار کی دھار سے زیادہ باریک اور تیز کہتے ہیں جذبہ کو پیش کرنے کا نیا نیا سائنٹفک انداز سوانح عمری کو ناول سے علیحدہ کرتا ہے۔

ناول اور سوانح نگاری کا بیّن فرق اس وقت محسوس ہوتا ہے
جب کہ لکھنے والا یہ غور کرتا ہے کہ آیا وہ کسی شخصیت کو پوری طرح
پیش بھی کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس وقت اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ
وہ ایسا کرنے سے قاصر ہے جونہی وہ اس خیال کو پکڑنے اور گرفت
میں لینے کی کوشش کرتا ہے وہ پھسل پڑتا ہے۔ اور فوراً دو صورتیں
اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی ایک تو اس کا ظاہری اور علمی وجود جو کہ
شہادتوں اور دوسرے ذرائع سے منکشف ہو جاتا ہے کہ موضوع
یا صاحب سیرت فلاں فلاں جگہ گیا اور فلاں فلاں وقت میں اس
عورت سے ملا اور ایسے ایسے کام کئے۔ دوسری طرف اس کا باطنی
اور ذہنی وجود۔ اور اس کی زندگی کا یہی پہلو ہے جو سوانح نگار
کی گرفت سے بار بار نکل پڑتا ہے اور ناول نگار بآسانی اس
کا احاطہ کر لیتا ہے۔ کیونکہ اس کو یہ آسانی ہوتی ہے کہ اپنے ہیرو کے
ایک فعل کو مجسم پیش کرنے کے بعد بھی اس فعل کے ارتکاب
کے وقت اس کے جذبات اور احساسات کو بھی پیش کر سکتا ہے
اور اس نازک مرحلے کا اندازہ کر کے بتا سکتا ہے جس کے ماتحت
ہیرو سے وہ فعل سرزد ہوا ہے۔ ان حالات اور واقعات کو
اپنے نظریہ کی کسوٹی پر رکھ کر اس کے فعل کی مدحت یا مذمت میں
ناظر کو اپنا ہم خیال بنا لیتا ہے Mar uios نے اس کی مثال
یوں دی ہے کہ بالفرض میدان جنگ میں ایک سپاہی جس کو

آگے بڑھ کر حملہ کرنا تھا بجائے آگے بڑھنے کے کسی جگہ چھپا ہوا ملتا ہے۔ اور اس کا افسر اس کو اس حال میں دیکھ لیتا ہے تو وہ اس کو بزدل اور فرض ناشناس سمجھتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد یہ بات اس کے سوانح نگار کو معلوم ہوتی ہے تو وہ اس کی سوانح عمری میں محض یہ واقعہ درج کر دیتا ہے کیونکہ مشاہدہ اتنی ہی اجازت دیتا ہے اور اس کا شمار تاریخ میں کم ہمت سپاہیوں میں ہوتا ہے۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ سپاہی کے نقطۂ نظر سے اس کا سبب کچھ اور ہو۔ کیا تعجب کہ وہ آگے بڑھ کر حملہ کرنے کا ارادہ ہی رکھتا ہو۔ لیکن اس کی قوت نے جواب دے دیا ہو۔ اس طرح ناول نگار ایک طرف تو افسر کے جذبات کو ظاہر کرنے کا مجاز ہوگا دوسری طرف سپاہی کی مجبوری کی وضاحت بھی کر سکتا ہے۔ اور بقول رومن فرینڈز

(Roman Farandez)

رہم ناظر اور کردار کی غلطیوں کے درمیان توازن قائم کر سکتے ہیں کیونکہ کردار کم و بیش اپنے احساسات کا فریب خوردہ ہوتا ہے اور ناظر اس کی حرکات اور سکنات سے دھوکے میں مبتلا ہو جاتا ہے دیکھنے والا سوچتا ہے کہ اس نے جو کچھ کیا وہ اس کی مصلحت کے تو ہین تھا یا منافی بہر حال میں نے وہی دیکھا جو اس نے کیا،

اور یہی جملہ یعنی بہر حال میں نے وہی دیکھا جو اس نے کیا سوانح نگار کا حصہ ہے وہ اپنے ہیرو سے کتنی ہی عقیدت یا نفرت

کیوں نہ رکھتا ہو مگر اس کو کہنا وہی پڑے گا جو اس نے دیکھا اور یہ عقلی امکانات اور دلائل پیش کرنا اس کا کام نہیں۔

سوال یہ ہے کہ فنِ سوانح نگاری کی یہ ٹکنیک اور پابندیاں کس طرح رفتہ رفتہ وضع ہوئیں اور عائد کی گئیں جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ازمنۂ قدیم بلکہ عہدِ بربریت سے انسانی زندگی کے حالات اور کارنامے محفوظ کرنے کا رواج چلا آ رہا ہے۔ اسی طرح اس کے اصل اصولوں اور ٹکنیک میں بھی تجربوں اور وقت کے لحاظ سے برابر تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ جوں جوں یہ فن ارتقائی مراحل طے کرتا گیا۔ اس میں فنی اور سائینٹفک پہلو پیدا ہوتے گئے۔ لیکن اس کی اتنی واضح صنف جدید زمانے کی ایجاد ہے چنانچہ ایڈمنڈ گوس

Encyclopedie Brittanica کے صفحہ ۵۹۳ پر اس کی تعریف یوں کرتے ہیں: "فنِ سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کا فرق جدید زمانے کی ایجاد ہے اس سے قبل اس کو ادب میں مستقل اور جداگانہ حیثیت حاصل نہیں تھی یہاں تک پلوٹارک بھی اس کے متعلق فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ یہ تاریخ سے جدا صنفِ ادب ہے۔"

دراصل مغرب میں باقاعدہ طور پر سب سے پہلے پلوٹارک نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اشخاص کی اخلاقی سیرت اور شخصی کردار کو قلم بند کرنا چاہیے۔ سوانح عمری کی شکل میں پہلی تصنیف Xwnophon کی Memoirs of Secratas ملتی ہے۔ پہلی صدی

کے آخر میں پلوٹارک نے دنیائے ادب میں Parallel lives پیش کی جس میں چالیس یونانیوں اور رومیوں کے حالات زندگی پیش کئے گئے ہیں۔ پلوٹارک Taatus اور Suezonius کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں بہت صحیح اصولوں پر مبنی ہیں یہ ہیئت کے اعتبار سے اور کردار کو آئیڈیل نہ بنا کر پیش کرنے کی اچھی مثالیں ہیں Merklongaker نے مذکورہ سوانح نگاروں کے متعلق کہا ہے۔

"ان سے بڑھ کر سوانح نگاری کا فرض کم ادا کیا گیا ہے لیکن عہد الزبتھ کے مصنفوں کو اس میں کوئی قابل تقلید بات نظر نہ آئی۔"

اگرچہ انگریزی ادب میں سوانح نگاری کا وجود اواخر عہد ہنری ہشتم ملتا ہے لیکن اس کا کوئی مستقل اور واضح تصور اٹھارویں صدی تک نہیں ملتا اس سے قبل کی سوانح نگاری میں مختلف ... رجحانات اور نظریات ملتے ہیں۔ جن کا مختصر جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ان نظریات اور رجحانات سے متعلق ایک حلقہ وہ ہے جس کے نمائندہ مصنفین ولیم روپر۔ جارج کیونڈش ٹامس سپراٹ اور جان ڈرائیڈن ہیں۔ اس حلقہ کے لکھنے والوں کا نظریہ فن قدیم اور جدید نظریہ سوانح نگاری سے مختلف تھا ان کا اندازِ نظر یہ

ہوتا تھا یہ اپنے موضوع اور ہیرو سے بہت زیادہ وفاداری اور جانب داری کا سلوک کرتے تھے۔ یہ حلقہ سنجیدہ پردہ داری ہی کا قائل نہ تھا بلکہ مصلحت اور نظریات کا شکار ہو کر بے جا پردہ پوشی کرتے تھے اس حلقے کی اہم ترین تصنیف ولیم روپر کی لکھی ہوئی سر ٹامس مور کی سوانح حیات ہے۔ اگرچہ یہ کتاب سترھویں صدی یعنی ۱۶۲۶ء میں طبع ہوئی لیکن ۱۵۴۸ء میں لکھی گئی تھی۔ ولیم روپر نے اپنے خسر کی یہ سوانح عمری بڑے جذباتی انداز میں لکھی ہے۔ اگرچہ مصنف کو حسن اتفاق سے اپنے ہیرو کے ساتھ زندگی کے سولہ سال گزارنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سر ٹامس مور کا مطالعہ اس خیال سے کیا ہی نہیں کہ اس کو اپنی سوانح نگاری کا موضوع بنائے گا۔ بلکہ وہ اس کو اپنے قابل احترام خسر کی ہی حیثیت سے دیکھتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی یہ کتاب تشنہ ہے۔ اس سے زیادہ ٹھوس معلومات اور تفصیلات دوسرے مصنفین نے ٹامس مور کے بارے میں بہم پہنچائی ہیں۔ روپر کی تصنیف اور بیان کے مطابق ٹامس مور نیکی، رحم اور شرافت کا مجسمہ نظر آتا ہے اور ان تمام کمزوریوں کا نام و نشان بھی نہیں ملتا جن کا ذکر اس کے بعض ہمعصروں نے کیا ہے۔

جارج کیونڈش اس حلقہ کا ایک مصنف ہے اس نے کارڈینل کی سوانح حیات لکھی ہیں۔ اور ولیم روپر کی طرح وہ بھی

اس تمام مواد اور موقع سے جو اسے دولنزے کی چار سالہ ملازمت میں حاصل ہوا تھا فائدہ نہ اٹھا سکا۔ جس کی وجہ سے اس کا وہی موضوع سے وفاداری اور چشم پوشی کا نظریہ تھا۔ دراصل کیونڈش کا مقصد یہی تھا کہ وہ اپنے آقا کے خلاف پھیلائے ہوئے مسموم خیالات اور واقعات کا ازالہ کرے جو دوسرے سوانح نگاروں اور مخالفین نے پھیلا رکھے تھے۔ وہ ایک دلکش اسلوب کا مالک تھا۔ لیکن دولنزے کی باریکیاں اور پیچیدگیاں پیش کرنے سے قاصر رہا۔

Gravnille Fulke اور بشپ اسپریٹ ہی ایسی خیال اور نظریئے کے قائل تھے Fulke کی تصنیف سر فلپ سڈنی کی سوانح عمری کا مقصد سوانح نگاری سے زیادہ اس کی خدمت میں ہدیۂ تحسین و عقیدت پیش کرنا تھا۔ اسی طرح بشپ اسپریٹ نے ادب میں جو مقام حاصل کیا تھا وہ اس کی سوانح نگاری کے کمال کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اس کی شستہ اور دلنواز زبان اس کے تخیل پر جوش مجانہ خلوص کے طفیل تھا۔ غرض سترھویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک سوانح نگاری کا عام رجحان یہی تھا۔ اگرچہ اس صدی کے نصف تک وہ واقعات جو حالات زندگی کے تحت لکھے جاتے تھے۔ فن سوانح نگاری کے حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ لیکن عرصہ تک اس کا رجحان مدحیہ موصوف نگاری ہی کی طرف رہا۔ باوجود اس کے کہ اسی صدی میں

اخلاقی جرأت کو بڑی اہمیت دی جا رہی تھی۔ اور فن سے مخلصانہ برتاؤ کیا جا رہا تھا۔ لیکن سوانح نگاری کا رشتہ مدحیہ وصف نگاری سے منقطع نہ ہو سکا تھا۔ لیکن یہ رجحان کلی طور پر حاوی نہ تھا۔ اسی صدی میں ڈرائی ڈن اور اس سے بھی کچھ پہلے فرانسس بیکن نے سوانح نگاری کے صحیح مقصد اور ادبی امکانات کو محسوس کیا اور اس پر غور کیا۔ قسام ازل نے اس فن کے حدود کا نقد و تبصرہ اور اس فن اور تاریخ میں امتیاز جان ڈریڈن ڈن کے حصے میں رکھی تھی۔ اور اس سلسلے میں اس کا نقد و تبصرہ اپنے عہد کی تنقید کی صف اول میں شمار کیا جاتا ہے۔

ڈرائی ڈن نے اس فن کی بڑی وضاحت اور صراحت کی ہے اس نے اس میں نئے اور دلچسپ امکانات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ سوانح نگاری یا مخصوص زندگیوں کی تاریخ اگرچہ موضوع کے لحاظ سے مختصر اور مجمل خاکہ ہوتی ہے پھر بھی استنائی کے لحاظ سے یہ بہت وسیع ہے اس کا اسٹائل موقع و محل کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے اس میں سادگی بیان اور سپاٹ پن کے بھی مواقع ہوتے ہیں۔ اور حسب ضرورت تاریخ کی سی سنجیدگی اور برتری کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔ ڈرائی ڈن نے سوانح نگاری اور تاریخ کا فرق اس طرح بیان کیا ہے۔

• تاریخ میں بڑے اور عظیم واقعات ہی پیش کرنے کی

اجازت ہوتی ہے اور ہم صرف مملکت اور سیاست کے ایوان اور فلک بوس کاخِ حکومت ہی کو نظارہ کر سکتے ہیں۔ لیکن سوانح نگار افراد کے بھی گھروندوں میں بھی جھانک سکتا ہے۔ وہ یہاں اس روپ میں نظر آئینگے انکے دکھ درد کھا و برتاؤ اور گفتگو کا جائزہ لیا جا سکتا ہے یہاں ہم سی بلو اور لاے کبیس Laelia کو ساحل سمندر پر گھومتے اور سیپیاں چنتے دیکھتے ہیں اور آگسٹس کو لڑکوں کے ساتھ پتھروں پر گد کے لگاتے دیکھتے ہیں۔ زندگی کا تصنع اور خول ہٹا دیا جاتا ہے۔ اور ہم اس حیوان ناطق کو اسی عریاں حالت میں پاتے ہیں جو اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔

ڈرائی ڈن کے بیان نے اس غلط فہمی کو بھی دور کر دیا ہے جو فرانسس بیکن کے طریق عمل سے پیدا ہو چکی تھی۔ بیکن عہد ہنری کا مورخ تھا اور اس کی مورخانہ حیثیت بھی زیادہ قابل قبول ہے۔ تاہم وہ تاریخ میں شخصی کردار کی عکاسی کا بھی قائل تھا۔ اس نے تاریخ کے ضمن میں ہنری ہشتم کی شخصیت کی جو عکاسی کی ہے وہ اگرچہ جغرافیائی اور تفصیلی نہیں تاہم اس کے کردار پر اچھی خاصی روشنی ڈالتی ہے۔ اس طرح تاریخ اور سوانح عمری خلط ملط ہو گئی۔ لیکن جان ڈرائی ڈن نے تاریخ اور سوانح کے درمیان حد فاصل کھینچ دی ہے۔

سترھویں صدی یا عہد الزبتھ کی ان سوانح عمریوں سے عہد جارج کے مصنفین بہت کم متاثر ہوئے اور اٹھارویں صدی کے لکھنے اور پڑھنے والے نے بخوبی اندازہ کر لیا کہ وہ سوانح نگاری کے معیار پر پوری نہیں اترتیں ان سوانح عمریوں کے متعلق Longaker نے کہا ہے۔

, Oldys, Mason, Jhonson and others—regarded them as models to be avoided, and as a lesson in what not to do.

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ موجودہ تصور اس صدی سے قطعی مستورد اور غیر متاثر ہے سین نے اپنی Life and letters of Grey جو انگریزی سوانح نگاری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ سترھویں صدی کے آئزک والٹن ہی سے متاثر ہو کر لکھی ۱۶۶۲ء عیسوی میں والٹن نے سوانح نگاری کے سلسلہ میں خطوط کی اہمیت اور ادبی حیثیت کو محسوس کیا اور یہ اس کا خیال تھا کہ خطوط ادبی شخصیت کے انکشاف کا بہترین وسیلہ ہیں لیکن اس کے مزاج میں نرمی اور چشم پوشی تھی اور اس کی نظر میں انہی خطوط کو آلہ کار بنانا مستحسن تھا۔ جن کے ذریعہ صاحب سیرت کے مزاج کے اچھے اور دلنشین پہلو اجاگر ہو سکیں۔

بہر حال میسن نے اس تصور سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ کسی کے حالات زندگی اور کردار کا مرقع تیار کرنے میں بے تکلف دوستوں کے وہ نجی خطوط جو لغرض اشاعت تحریر نہ کیے گئے ہوں بے حد کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرز کی تقلید کا بہترین نمونہ بوسول کی Life of Dr. Jhonson ہے جو دنیا کے ادب کی

دلچسپ ترین سوانح عمری خیال کی جاتی ہے۔ جو ۱۷۹۱ء میں شائع ہوئی اور بڑی جامع سوانح عمری خیال کی جاتی ہے۔ لیکن برسول نے یہ سوانح عمری شدتِ احترام اور جذبۂ عقیدت سے اس درجہ مغلوب ہو کر لکھی تھی۔ کہ کارلائل کو اس کے متعلق کہنا پڑا

"Boswell was inspired only by love and the recognition and the vision which love con hehd"

بہرحال برسول کی یہ تصنیف اس درجہ مقبول ہوئی کہ انیسویں صدی کے بیشتر سوانح نگاروں نے اس کو نمونہ بنایا اور کارلائل نے اس پر نکتہ چینی کر کے نئے امکانات اور رجحانات کا راستہ کھول دیا جن میں سے ایک جدید رجحان علم النفس ہے جس کے زیر اثر سوانح عمری سیرت نگاری بن گئی۔ جدید تذکرہ نگار کا کام محض اپنے ممدوح کے حالات پر روشنی ڈالنا ہی نہیں۔ بلکہ اس کی شخصیت کو بے نقاب کرنا اور اس کی ذہنی پیچیدگیوں اور ارتقار کا سراغ بھی لگانا ہے۔

دوسرا انقلاب لٹن اسٹریچی کی نگارشات نے پیدا کیا۔ اس نے ان ضخیم سوانح عمریوں کے خلاف آواز اٹھائی جن میں بغیر کسی مرکزی تخیل کے ممدوح کے جملہ حالات کا انبار لگا دیا جاتا تھا۔ اور جو نہ تو قاری کی دلچسپی کا سامان بن سکتی تھیں۔ نہ ہی ان میں صاحب تذکرہ کی شخصیت کی عکاسی ہو سکتی تھی۔ لٹن اسٹریچی سیرت نگاری کو ایک

ایسا آئینہ بنانا چاہتا تھا جس میں پہلا اور روشن عکس صاحب تذکرہ کا ہو اور دوسرے تمام ضمنی واقعات پس منظر کے طور پر اس طرح جھانکتے نظر آئیں گویا شخصیت ان میں سے ابھر کر سامنے آ کھڑی ہو۔

اٹھارھویں صدی نے سوانح نگاری میں خطوط اور آپ بیتی کی اہمیت اور مقام کو متعین اور مستحکم کر دیا بنشۂ۱۷۲ء میں CTUll نے جو لندن کے پڑھے لکھے عوام کے مطالبات اور رجحانات سے بخوبی واقف تھا۔ اور اسے خطوط کی کرامات کا بھی علم تھا۔ تمام نیک نام اور بدنام زمانہ ممتاز شخصیتوں کے خطوط فراہم کئے۔ اس نے بڑی کوشش اور کاوش سے Pope swift Congrave, Jhon Dryden وغیرہ کے خطوط جمع کر کے شائع کئے جنھیں عوام نے ذوق شوق سے پڑھا Longaker English Biography of 18th Century میں خطوط کے متعلق کہتا ہے۔

"علم الرجال کے لئے بھی خطوط سے زیادہ بہتر اور کوئی راستہ نہیں۔ خطوط کے ذریعہ انسانی فطرت کی ان سرحدوں میں بے دھڑک داخل ہو سکتے ہیں۔ جن میں سوانح عمری اور آپ بیتی کو اذنِ باریابی نہیں ملتا۔"

خطوط کی طرح روزنامچوں کا بھی صحیح استعمال اٹھارھویں صدی میں شروع ہوا اگرچہ اس سے قبل Pepys اور Evelyn کے روزنامچے اس بات کے شاہد ہیں کہ اس سے قبل یہ رجحان موجود

تھا۔ روزنامچوں کا ادبی سرمایہ بہر حال رومانیت اور ماورائیت کے لئے موزوں نہ تھا۔ اس میں مندرجہ تجربات اور نظریات کسی طرح زندگی کو خیالی اور تصوراتی انداز پر پیش کرنے کا موقع نہیں دیتے۔ اور بقول Longaker

"ایک دیانت داری سے لکھے ہوئے روزنامچے ہیں
بڑے سے بڑا انانیت پسند بھی گوشت کا انسان رہ
جاتا ہے۔"

روزنامچے میں مصنف نہ صرف اپنی روزمرہ مصروفیات کا انکشاف کرتا ہے۔ بلکہ اپنی انفرادی شخصیت کی سچی تصویر بھی دکھا دیتا ہے۔

Paynne نے Remark on Arch Bishop Land میں لکھا ہے۔

"An exact diary is a window into the
heart that maketh it"

روزنامچوں اور خطوط کے علاوہ آپ بیتیوں کا وجود بھی سترھویں صدی میں موجود تھا۔ لیکن اس کا انداز بھی وہی ماورائی اور رومانی تھا۔ مصنف اپنے متعلقین اور خود اپنے کردار کو ایسا آئیڈیل بنا کر پیش کرتا تھا کہ دنیا ان کو بہترین اور یکتا شخصیت مان سکے۔

"Marchoiness of new castle" اور Margaret Cavandish

کی خود نوشت سوانح عمریاں سترھویں صدی کے مخصوص طرز کی مثالیں ہیں ۔ لیکن رفتہ رفتہ آپ بیتیاں لکھنے والے روز بروز حق بات کہنے میں نڈر اور بے باک ہوتے گئے ۔ ان کی جرأتِ اظہار برابر ارتقائی مراحل طے کرتی رہی ۔ یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں خود نوشت سوانح عمریوں کو غلط بیانی اور تصنع واقعات سے مکمل نجات مل گئی ۔

اٹھارھویں صدی کا یہ انقلاب اتفاقاً نہیں آیا نہ اس کے لئے تجدید و انقلاب کے کسی نئے عمل کی ضرورت تھی جبکہ سترھویں صدی کے نصف آخر ہی کے نمونوں پر موجودہ سوانح نگاری کی بنیاد رکھی گئی ۔ اور جس طرح ناول نویسی وقت اور زمانے کے ساتھ اپنا چولا بدلتی رہی تھی ۔ اور مذاق عامہ کے ساتھ ساتھ خود کو ڈھال رہی تھی ۔ بالکل اسی طرح سوانح نگاری بھی وقت کے تقاضوں کے دوش بدوش چل رہی تھی ۔

البتہ یہ امر غور طلب ہے کہ مذاق عامہ اور مصنفین کا رجحان اتنی جلد جلد کیسے آگے بڑھ رہا تھا ۔ دراصل چارلس دوم کے عہد میں انگلستان نے فرانس کو اپنا پیش رو نہ صرف زندگی کے بعض پہلوؤں میں بلکہ ادب کو قبول کیا اور ادب میں اس کی تقلید کو قابل فخر سمجھا جس کی صراحت Longaker نے یوں کی ہے ۔

"The Pranch spirit became more than a brilliant veener on British Institutions,

It had a perceptible influence on the English mind."

لوئی چہاردہم کے عہد میں فرانس کا نظریہ ادب جس نے انگلستان کے مصنفین پر اتنا زبردست اثر ڈالا حسب ذیل ہے۔

۱۔ ان کو مستقبل اور ماضی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بلکہ انسانی تجربے کی حقیقتوں اور حال سے سروکار تھا۔

۲۔ موہوم تخیل ناقابل قبول تھا۔

۳۔ ادب کی مساعی میں مواد کی ہیئت اور حقیقت ہی سے سروکار رکھا جاتا تھا۔

۴۔ زندگی کے سبق آموز پہلوؤں سے بلا واسطہ تعلق نہ تھا۔ ہر پہلو کو آنکھ کھول کر اور آنکھوں پر سے ہر قسم کے پردے اٹھا کر دیکھا جاتا تھا۔

۵۔ شاہ و گدا میں یکساں انسانی خاصہ اور فطرت کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔

۶۔ وہ زندگی پر طنزیہ مسکرانے کے عادی نہ تھے بلکہ زندگی کے حقائق کا دلچسپی اور ہمدردی سے مشاہدہ کرنے کے قائل تھے۔

۷۔ ان کا نظریہ مادی اور دنیاوی تھا زندگی کے ممکن اور ٹھوس پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے۔ انگلستان میں اس نئی روح کے اثرات کا نتیجہ سریع اور یقینی تھا۔ یہاں تک کہ مذہبی رہنماؤں نے مذہب

کو ماورائیت سے نیچے اتار کر سماوی کی بجائے اس کو ارضی حیثیت دی ہے۔

عقل و فہم کو ادب میں اولین درجہ دیا گیا۔ فنون کی تمام صورتوں میں عینیت اور یقین اور حقائق پر ایمان کو ہی اہم ترین مقصد قرار دیا گیا

اس صدی کے نصف اول کے اختتام سے قبل ہی کوڈ فرے نخورن ہل بیارلس جروکس نے افسانے پیش کئے ایسے نہیں جیسا انہیں ہمارے خیال میں ہونا چاہئے تھا۔ بلکہ ایسے جیسے کہ وہ تھے۔ فن تعمیر نے بھی سادہ اور صاف لائن اختیار کر لی تھی۔ اور اس میں کلاسزم کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اسی طرح ادب کی مختلف اصناف نے ثابت کر دیا تھا کہ انسان کا مطالعہ انسان ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے حقیقت اور جمالیات ایک دوسرے کے مترادف الفاظ ہو گئے تھے۔ تنگ و تاریک جھونپڑے میں رہنے والے انسانوں کی تشبیہ یا مصوری محلوں میں بسنے والی نرم و نازک دوشیزہ سے زیادہ دلکش اور حسین سمجھی جانے لگی۔ لہلہاتے ہوئے کھیت تاریخی واقعات سے زیادہ قابل اعتنا ہو گئے۔

اس بڑھتی ہوئی حقیقت پسندی میں سوانح نگاری کا نیا اور مستحکم تصور بھی بروئے کار آیا۔ ایسے وقت میں جب کہ ہر صنف ادب میں یہی کوشش کی جا رہی تھی کہ سچائی اور حقیقت کو جگہ دی جائے اور زندگی سے قریب تر اور حقیقی کردار پیش کئے جا رہے تھے تو پھر

سوانح نگار کیوں نہ شاعروں۔ بادشاہوں اور سپاہیوں کو اپنے تصنیفات میں اسی دنیا کے باسی دکھاتا۔ زندہ اور متحرک جن میں عیوب اور محاسن کا سنگم ہوتا ہے۔

حقیقت پسندی اور راست نگاری کی اس رو کو قہوہ خانوں نے بہت زیادہ تقویت پہنچائی۔ یہ قہوہ خانے اس دور کی زندگی اور تمدن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہاں سے ہم دور و نزدیک پھیلی ہوئی اور ہر آن نئی کروٹیں لیتی ہوئی زندگی کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ ان قہوہ خانوں میں ہر گوشہ اور طبقے سے لوگ آکر جمع ہوتے۔ یہ ہر مزاج اور ہر مذاق کے انسان ہوتے تھے۔ سنجیدہ علمی باتوں سے لے کر بے پر کی خبریں تک اڑائی جاتیں۔ ہر کس وناکس پہ بے دھڑک خیال آرائیاں اور نکتہ چینیاں کی جاتیں۔ بڑے بڑے اعیان سلطنت کی مخالفت کے باوجود قہوہ خانے اپنا کام کرتے رہے اور بڑے بڑے آدمیوں کو عام انسانوں کی صفوں میں لا لاکر کھڑا کرتے رہے۔ حقیقت پسندی کی اس ایک تحریک نے ڈائریوں خودنوشت سوانح عمریوں۔ مطبوعہ خطوط کتابوں اعترافات کیریکٹر اسکیچ اور ناولوں کو واضح اور ادبی شکلوں میں تسلیم کیا اور ان میں اضافہ نے فن سوانح نگاری سے مفروضہ اخلاقی اقدار اور رومانیت کو نکال باہر کیا یہ ہے انگریزی فن سوانح نگاری کے ارتقائی منازل کی مختصر داستان جو اس نے تقریباً تین سو سال میں طے کیے عجیب بات ہے کہ اردو زبان جس کی پوری زندگی ہی تقریباً اتنی ہے جتنی انگریزی سوانح نگاری کے

۹ Confessions

ارتقا رکا زمانہ اپنی تمام اصناف ادب میں سب سے زیادہ مغرب کی تاریخ اور سوانح نگاری ہی سے متاثر ہوئی ہے۔ کیوں اور کس طرح یہ آئندہ ابواب میں تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔ فی الحال صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہماری زبان جو فارسی اور عربی سے مربوط ہے ان زبانوں کی سوانح نگاری سے کس درجہ متاثر ہوئی۔ اور خود ان زبانوں میں اس صنف ادب کا کیا حال تھا

قبل اس کے کہ عربی زبان کے فن سوانح نگاری کا جائزہ لیا جائے یہ واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں اگرچہ عربی اصناف سوانح نگاری کی طرز پر تذکرے اور یادگاریں وغیرہ لکھی گئیں۔ لیکن عربوں کی تحقیق و تدقیق کو اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب اپنی کتاب

"The spirit and substance of Urdu Prose under the influence of Sir Saiyed Ahmad Khan"

میں فرماتے ہیں کہ

"Unfortunately the critical methods of investigating truth and the ideal of presenting true portraits which the Arabs knew were rarely adopted by the writers of Persian & Urdu."

اس امر کی وضاحت کے بعد کہ اردو سے قریب تر زبان فارسی کی فن

۱۔ Unfortunately

۲۔ Confessions

سوانح نگاری نے عربوں کی سوانح نگاریوں سے کوئی خاص تاثر قبول نہیں کیا تفصیلات میں جانا بے کار ہے۔ صرف اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ عربی ادب میں اس صنف ادب کا بیش قیمت اور گران قدر سرمایہ موجود ہے جس کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے لکھا ہے۔

"یہ سوانح عمریاں نہ صرف مواد کے اعتبار سے اہم اور دلچسپ ہیں بلکہ فنی لحاظ سے بھی حسین و دلکش ہیں۔"

عربی زبان کی زیادہ قابل اعتماد سوانح عمریاں وہ ہیں جو سیرت رسول پر لکھنے والوں کے انداز سے متاثر ہوئیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگار ایک طرف تو تفصیلی جزئیات تمام بند کرتے تھے دوسری طرف روایتوں کی صحت کا بڑا خیال رکھتے تھے اس سلسلہ میں خود راوی کے حالات اور کردار کا بھی جائزہ لیتے تھے۔ ان کے علاوہ خلفاء وزراء سفیروں اور فوجی افسروں کے حالات بھی لکھے گئے ہیں لیکن ان سب کی بنا محض روایت پر ہے۔ کسی شاعر یا ادیب کی کوئی معیاری سوانح عمری نہیں لکھی گئی۔ تاہم عربی سوانح عمریوں میں اعلیٰ سوانح عمری کے بہت سے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک عنصر نجی جزئیات کی فراہمی ہے۔ جن میں سے امور خانہ ذہن رکھنے والے عموماً گریز کرتے تھے یہاں بھی سیرت رسول کے انداز نے بڑا فائدہ پہنچایا۔ آنحضرتؐ کی زندگی کے عام حالات اور امور اندرون خانہ کی زندگی کی ہر ہر بات کتابوں میں محفوظ ہے۔ اس سے وہ حجاب تو دور ہو جاتا ہے جو عظیم

شخصیتوں کی خلوت اور جلوت کے درمیان پڑا رہتا ہے۔ تقریباً چار صدیوں تک سوانح عمری کا یہ تصور عربی ادب پر چھایا رہا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ سلطانی اور ملوکیت کے اثر سے انسان کی زندگی کے دو دائرے مقرر ہوتے گئے جلوت اور خلوت اسی طرح عام انسان اور بادشاہ دو الگ قسم کی مخلوق قرار پائیں اس لئے " انسان " اور انسانیت سوانح عمری کے موضوع سے خارج ہوتے گئے۔ فارسی بھی اسی سے متاثر ہوئی۔ قدیم عربی۔ فارسی سوانحی ادب میں اہل علم و ادب کو بڑی جگہ حاصل ہوئی۔ ان کے تذکروں اور سوانح عمریوں بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اسی طرح اولیاء و صلحاء کے مناقب کا سرمایہ بھی کچھ کم نہیں۔ عربی میں ان سے الگ بھی کئی شاخیں ہیں مثلاً مجانین کے تذکرے، ظرفا بخلا۔ اندھے عالموں کے تذکرے اسی طرح زندگی کی ندگارنگی بہت سی اور صورتوں میں بھی منعکس ہوئی۔ ان میں افراد کی زندگیاں بھی ہیں اور طبقات کی سوانح عمریاں بھی (جولازماً مختصر تھیں)، مگر فارسی میں یہ ذخیرے موجود نہیں۔ قدیم ادب میں سوانح عمریوں کی کئی صورتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ان کا مختصر حال یہ ہے

سیرت — یہ حضرت رسول اکرم ﷺ کی حیات پاک کا ایک خاص نصاب ہے جو حدیث کے طریقے سے مرتب ہوتا ہے (عربی زبان میں اس کی بہترین مثالیں ملتی ہیں)، بعد میں سیرت پر عام سوانح عمریاں بھی لکھی گئیں۔

مغازی یہ بھی حیات پاک کا ایک رخ ہے۔ اس میں آپؐ کے غزوات اور جنگوں کا تذکرہ ہوتا تھا۔

طبقات یہ تذکرہ کے قسم کی تدوین تھی۔ جس میں زمانی مکانی بنیادوں پر مختلف طبقات کے تذکرے درج ہوتے تھے۔

معجم اس میں طبقات کے مختصر حالات حروف تہجی کی قید سے درج کئے جاتے تھے۔

مناقب اولیا ریا دوسرے اعاظم رجال کی سوانح عمریاں مدحیہ انداز میں۔

ملفوظات واقوال کے نام سے بعض اوقات اولیار یا دوسرے بڑے لوگوں کی زندگی کے بعض رخ پیش کر دیئے جاتے تھے۔

یادگار سوانح عمری کا مدحیہ انداز

حقیقت یہ ہے کہ قدیم زمانے میں افراد سے زیادہ مصنفوں کی جماعتوں یا طبقوں کی سوانح نگاری کی طرف توجہ ہوتی۔ افراد کی سوانح عمریاں کم ہیں اور جو ہیں ناقص ہیں۔ البتہ طبقوں اور گروہوں کے سوانح بہت ملتے ہیں ان میں سب سے زیادہ تذکروں کو فروغ ہوا۔ یہ تذکرے صرف شاعروں تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ اس صنف میں سلاطین امرار علمار اولیار وصفیار اور اس طرح کے دوسرے طبقے بھی شامل ہیں۔

افراد کی سوانح عمریوں میں یادگاری خصوصیات غالب ہوتی تھیں۔ اور سوانح عمری لکھنے کا ہی مقصد یہ ہوتا تھا کہ کسی خاص شخص کی تعریف کی جائے۔ حالی کے زمانے میں اصلاحی مقصد پیش نظر تھا۔ مگر حالی سے قبل اصلاحی مقصد بھی مدنظر نہ ہوتا تھا۔ یا منقبت یا پھر یادگار۔ اس سے زیادہ سوانح عمری سے کچھ مطلوب نہ تھا۔

تذکروں میں۔ جو سوانح نگاری کے صرف ایک پہلو اور ایک نوع کی نمائندگی کرتے ہیں، اچھی سوانح عمریوں کے ایک دو عناصر ضرور ملتے ہیں بعض اوقات ان میں زندگی کے اچھے اچھے مرقعے تیار ہو جاتے تھے۔ اور ہم ان کے ذریعے بڑی بڑی شخصیتوں کے ظاہر و باطن سے اچھی واقفیت بہم پہونچا سکتے ہیں۔ مگر تذکرے بہرحال تذکرے ہیں۔ سوانح عمریاں نہیں جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا۔

قدیم سوانحی ادب کا نقطۂ نظر سراپا تاریخی تھا۔ سوانح عمری کا مورخانہ رنگ ہماری ادبیات میں عرصے تک غالب رہا ہے۔ اس میں قدرتاً صداقت اور حقیقت کی تلاش ہوتی تھی۔ مگر صرف نمایاں واقعات کی تلاش تک محدود تھی۔ جزئیات اور بشری تفصیلات کی جستجو ان سوانح نگاروں کے پیش نظر نہ تھی۔ مورخانہ سوانح عمریوں کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو پھر قدیم سوانح میں خیالی اور عقیدتی عناصر کی بھرمار ہے جن میں نہ واقعات ہیں نہ صداقت کی کوئی جستجو ہے ان میں عام قصے روایتیں۔ کہانیاں

ملفوظات و اقوال سب کچھ ہے مگر حیات کی ہو بہو تصویر کہیں بھی نہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہہ دینا شاید غلط نہ ہوگا کہ مغرب کی طرح حقیقی بیوگرافی مشرق میں بھی بہت دیر سے نمودار ہوئی اور شاید یہ بھی غلط نہیں کہ اس کا فروغ مغربی ادب کے زیر اثر ہی ہوا ہے۔

دوسرا باب

اردو سوانح نگاری حالی سے پہلے

کسی زبان کا ادب اور اس کی اصناف کا فنکارانہ اور صناعانہ ارتقار بہت کچھ بلکہ تمام تر اس کے گرد وپیش اور ماحول پر منحصر ہوتا ہے۔ کسی سماج میں جتنے صحت مند عناصر پائے جائیں گے اتنی ہی صحت مند اور بنی سنواری اصناف ادب کی بھی تخلیق ہوگی۔ ماحول اور اقتصادی حالات جس قدر پرسکون مگر زندہ اور متحرک ہوں گے اسی قدر سلجھا ہوا اور جمالیاتی ادب ظہور پذیر ہوگا۔ لیکن جب زندگی میں انتشار ہوتا ہے۔ اس کے ارتقار اور معیاروں میں جمود اور پستی کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں تو یہ انتشار سب سے پہلے ادب میں ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ ادب کی جڑیں سماج ہی میں پیوست ہوتی ہیں۔ اور سماج ہی کے ذہن۔

اس کی آبیاری کرتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ دنیا کی سب سے کم سن زبان اردو جس کا موجودہ ادبی ارتقار اپنے سن وسال کے اعتبار سے ایک معجزے سے کم نہیں کہا جا سکتا کچھ ایسے ہی ناساز گار حالات میں وجود میں آئی اور پروان چڑھتی رہی جو کسی زندہ ادب کے تنزل اور ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کی اس قدر کم عرصہ میں حیرت انگیز ترقی کے باوجود اس کی بعض اصناف بہت پسماندہ نظر آتی ہیں۔ اور اس نے اس دور میں بھی وہ خاطر خواہ ترقی نہ کی جو زندہ زبانوں کا حصہ ہے ان پسماندہ اصناف میں سیرت نگاری اور سوانح نگاری بھی ہے۔ اور یہ شاید اس جدت و ترقی کے دور میں بھی ہمارے ادب کا بہت کمزور پہلو ہے اردو کو اگرچہ عربی کے توسط سے سیرت نگاری کا بڑا اچھا میدان ملا تھا کیونکہ اہل عرب اس فن میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔ اور مشرق میں علم الرجال کی مختلف صورتیں اور شاخیں موجود تھیں۔ مثلاً سیرت مغازی، طبقات، تذکرہ۔ حیات۔ مناقب۔ تراجم۔ یادگار اقوال۔ ملفوظات وغیرہ وغیرہ پھر سیرت ایک خاص معنی میں بڑی ہی ترقی یافتہ اور تحقیقی شعبہ بن گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگاروں نے اس سلسلہ میں بڑی توجہ اور تحقیق سے کام لیا۔ نہ صرف رسول مقبولؐ کی سوانح حیات اور واقعات کے سلسلہ میں چھان بین کی گئی۔ بلکہ راویانِ احادیث اور صاحب سوانح کے حالات زندگی خاندان

علمیت ۔ کردار اور پیشہ کے بارے میں بھی بڑی چھان بین سے
کام لیا گیا ۔ اور صداقت اور سچائی تک پہنچنے کے لئے حقیقی کوشش
عمل میں آئی ۔ جس کی بنا ر روایت و درایت ۔ جرح و تعدیل پر رکھی گئی
لیکن ساتھ ہی سیرت کے ساتھ چند خصوصیات بھی وابستہ ہو گئیں ۔ چونکہ
عام طور پر سیرت سے مراد محض رسول اکرمؐ کے سوانح حیات ہی لئے
گئے اور آپ کی ذات کو خطا اور تقصیر سے معرّا ٹھہرایا گیا ہے ۔ پیغمبر خصوصاً
نبی آخرالزماں انسانی اوصاف کا مکمل ترین نمونہ مانے گئے ہیں اور ان
سیرت نگاری لازماً انسانی فطرت کا ایک ہی پہلو پیش کرتی ہے ۔ یعنی
حسن سیرت اور حسن عمل ۔ بہر حال ہمارے مورخوں اور سوانح نگاروں
کا محبوب اور پسندیدہ موضوع سیرت نگاری رہا ہے ۔ لیکن ہمارے
قدیم سیرت نگاروں نے سیرت اور سوانح کے فنی پہلوؤں پر کبھی
توجہ نہیں دی ۔ جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہماری پوری تہذیب اور تمدن
کی طرح ہماری زبان نے بھی فارسی ادب کی ریزہ چینی کی ہے ۔ اور فارسی
کی تخیل آفرینی اس واقعیت کی متحمل نہ ہو سکی ۔ جو فن سوانح نگاری کی
اولین شرط ہے اور اہل اردو نے جب فارسی کی تقلید کی اور پیروی کو لازم
ٹھہرایا تو انہی کی طرح دوسری اصناف ادب اعلیٰ درجہ کی شاعری اور انشاء
پردازی کی طرف تو توجہ دی ۔ لیکن اس فن کو قطعی ناقابل اعتنا سمجھا اور
یکسر نظر انداز کر دیا ۔ البتہ جب تک فارسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا
تھا اور اپنی ہی امنگ اور صلاحیتوں سے کام لے رہے تھے ۔ اس وقت اس

فن کے چند ایسے نمونے مل جاتے ہیں۔ جن کی بنیادوں پر مناخرین چاہتے تو فلک بوس عمارتیں تعمیر کر سکتے تھے۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ اردو کی نظم و نثر دونوں ہی کے سلسلے میں دکن کو اولیت کا فخر حاصل ہے۔ لیکن ہماری حیرت اور تعجب کی انتہا نہیں رہتی۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ کردار نگاری اور سوانح نگاری اور سوانح کے اولین نقوش بھی دکن ہی میں ڈالے گئے سترھویں صدی عیسوی میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی دکنی ریاستوں کی زیر سرپرستی اردو ادب کے اولیں لیکن اعلیٰ اور پختہ نقوش ڈالے گئے۔ قلی قطب شاہ۔ وجہی۔ نصرتی۔ غواصی اور ابن نشاطی کے نام اردو ادب میں اس لئے فراموش نہیں کئے جا سکتے کہ انھوں نے مختلف اصناف ادب پر قلم اٹھا کر اس نومولود لیکن ہونہار زبان کے وسیع اور لامحدود امکانات کی طرف اشارہ کیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نصرتی کو شخصیت نگاری سے ایک خاص دلچسپی اور گہرا لگاؤ ہے۔ اور وہ اس فن پر خاصی قدرت بھی رکھتا ہے اس نے اپنے باپ کے مزاج اور عادات و خصائل کا بڑا دلچسپ اور واضح نقشہ کھینچا ہے اور چند ابیات میں اپنے باپ کے پیشے عقائد اور عادات کا بڑا مجمل بیان یوں دیا ہے۔

جو تھا منج پدر یک شجاعت مآب | قدیم یک سلحدار جم رکاب
اودشہ کام پر زندگانی سنے! | کمر بستہ تھا جا لغتا نی مئے۔
بن جائے جنسم آپ نانیک کام | ایسی زندگی میں کیا خوب کام۔
نظر دھر کے منج تربیت میں سدا | دکھیا تین بنج الیستے کر حرا

سکھ ہنجے تھے جانے دن لبس منے	بھرے لے بزرگاں کے مجلس منے

مندرجہ بالا ابیات سے ظاہر ہوتا ہے ۔

۱ ۔ نصرتی کے باپ دادا مسلمان سپاہی تھے ۔

۲ ۔ خواجہ بندہ نواز کے دل سے معتقد تھے ۔

۳ ۔ اس کا باپ شاہی فوج میں سلحہ داری کے عہدہ پر مامور تھا ۔

علاوہ ازیں نصرتی ان چند قدیم شاعروں میں سے ہے جنھوں نے اپنی زندگی کے کچھ حالات چھوڑے ہیں ۔ گلشن عشق میں عنوان جسب حال خود کے تحت اس نے صاف صاف اپنے باپ کے اوصاف و عادات اپنے بچپن کی تعلیم و تربیت اور ذوق شاعری سے لگاؤ کا حال قلم بند کیا ہے اسی نے اسی مثنوی میں اپنی جوانی شہزادہ علی سے قریب اور یگانگت کا حال بیان کیا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ اپنے مذہبی عقائد اور ان پر پابندی ۔ اپنے دوستوں کے نام سب کی تفصیل دی ہے ۔ اس سے بھی بڑھ کر اپنے گناہوں کا بھی اعتراف کیا ہے ۔ اور یہ بھی فخر کیا ہے باوجود اپنے گناہوں کے مذہبی فرائض کی ادائیگی سے غافل نہیں رہا ۔ اسی طرح اس کے ان افکار اور قصائد سے چند نتائج اور بھی اخذ کئے گئے ہیں جو خالصتہ اس کی نجی اور خانگی زندگی سے متعلق ہیں ۔ ہم پر باآسانی اس امر کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ باوجود اس کے کہ اس کی درباری زندگی شاندار تھی ۔ لیکن وہ اپنی خانگی زندگی سے مطمئن نہ تھا ۔ مثلاً اس کے کلام سے ان چند باتوں پر روشنی پڑتی ہے ۔

۱ - اس کا لڑکا بے حد شریر تھا - اکثر بھاگ جایا کرتا تھا - اور اپنے باپ کی چیزیں بیچ دیتا تھا -

۲ - اس کا مکان مختصر اور غیر آرام دہ تھا - جس میں بارش کے زمانے میں سخت وقت کا سامنا ہوتا تھا - اور بہت کم سامان تھا - مکان ٹپکنے اور گرنے کا بیان میر صاحب کے گھر کے بیان سے ملتا جلتا ہے -

۳ - اس کے ہمسائے ادنیٰ درجہ کے اوباش لوگ تھے جو ہمیشہ فساد برپا رکھتے تھے اور اس کو سکون نہیں ملتا تھا -

غرض کہ ہم دیکھتے ہیں - کس طرح ایک قادر الکلام اور باکمال شاعر چھوٹی چھوٹی بے حقیقت باتوں سے اسی طرح متاثر ہے جس طرح دوسرے عام لوگ ہوتے ہیں - اس کے دل کی دنیا میں بھی دکھ اور سکھ کی وہی دھوپ چھاؤں ہے جو اور لوگوں کو بے چین اور کبھی مسرور کرتی رہتی ہے

اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دکنی تاجدار کے پسندیدہ اور منہ چڑھے شاعر کو بھی اپنے بد طینت ہمسایوں کی بدولت چین نہیں ملتا اس کے پہلو میں بھی ایک باپ کا دل دھڑک رہا ہے جو اپنے بیٹے کی بے اعتنائیوں اور بد اعمالیوں پر چیخ اٹھتا ہے - تو ہمیں ایک انجانی مسرت اور نامعلوم سا اطمینان محسوس ہوتا ہے - اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں پہلے کی دنیا میں سانس لینے والا یہ شاعر ایک مکمل اور جیتے

جاگتے انسان کی شکل میں ہمارے بہت نزدیک کھڑا ہے نصرتی کی شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کا اس سے بھی واضح اور مکمل نقش علی نامہ میں ملتا ہے۔ اس میں نصرتی نے اپنے مخدوم اور محسن علی عادل شاہ ثانی کے حالات و سوانح قلم بند کئے ہیں۔

علی نامہ کا انداز تقریباً وہی ہے جو زمنہ قدیم میں رومیوں اور یونانیوں کا تھا۔ یا سترھویں صدی کے انگریزی ادب میں سوانح نگاری کا تصور تھا یعنی مورخانہ اور باورچی عجب اتفاق ہے کہ علی نامہ بھی سترھویں صدی عیسوی میں لکھا گیا۔ اور اس میں وہی روح عصر پائی جاتی ہے نصرتی نے اس منظوم سوانح عمری میں تاریخی پس منظر کو بڑی خوبی اور سلیقہ سے پیش کیا ہے۔ اور حالات کے ضمن میں دکن کے پورے ماحول سیاسی حالات سازشوں کی گرم بازاری کا نقشہ اس چابک دستی سے کھینچا ہے کہ تاری کے ذہن میں وہ پورا پس منظر آجاتا ہے۔ جس میں علی عادل شاہ کو ان تمام مشکلات کا سامنا اور مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ جو شیواجی کی سرکشی اور فتنہ انگیزی زمین داروں کی بغاوت اور مغلوں کے پے درپے حملوں کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔ لیکن باوجود اس مورخانہ اور خارجی انداز کے ہم اس کو علی عادل شاہ کی مکمل سوانح عمری کہہ سکتے ہیں۔ اس میں سوانح نگار نے کہیں بھی تاریخی صداقت اور ترتیب سے تجاوز نہیں کیا۔ صداقت اور تخیل کے تانے بانے سے صاحب سوانح کو ایک زندہ اور جاذب شخصیت بنادیا ہے۔ علی عادل شاہ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں میں بڑی خوبی سے

روشنی ڈالی ہے۔ اپنی شجاعت تدبیر اور دور اندیشیوں کے ساتھ وہ ایک محبوب اور دلنواز شخصیت معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے جستہ جستہ اشعار ہی دستیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ اشعار اپنے مصنف کے سوانح نگارانہ رجحان کی شہادت دیتے ہیں۔ واقفیت۔ تاریخی صداقت۔ شخصیت کے بارے میں محاکمہ کرتے وقت غیر جانب دار اور غیر جذباتی رہنا یہ سب ایک کامیاب سوانح نگار کے اوصاف ہیں۔

نصرتی کے علاوہ دکنی مخطوطات میں ایک اور سوانحی انداز کی مثنوی کا ذکر ملتا ہے۔ یہ مثنوی "غوث نامہ" ہے اس کا مصنف رومی ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ برٹش میوزم میں بھی ہے۔ یہ مخطوطہ بلوم ہارٹ کی کیٹیلاگ مرتب ہونے کے بعد میوزیم میں داخل ہوا ہے۔ اس لئے اس کے بارے میں کوئی صراحت نہیں کی جا سکتی۔ یورپ کی کسی دوسری کیٹیلاگ میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ اس مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۱۰۹ھ ہے جس کا ذکر مصنف نے بھی کیا ہے

اتھے سو اگیارا کیتی اس پو نو ہو ختم یو نسخہ نصر یو۔

میاں حسین شاہ ذوقی عہد اورنگ زیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو اپنی شاعری پر ناز ہے۔ خود کو نصرتی سے بلند مرتبہ اور اپنی فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے سحبان اور حسان ہند تصور کرتے ہیں چنانچہ "غوث نامے" میں ایک جگہ نصرتی کے کمال کا اعتراف کرتے ہوئے بھی اپنا مرتبہ بتاتے ہیں کہ

اتھا نصرتی ہر چہ دکھنی میں فرد ہوئے مثنوی سوں میری زرد

اس مثنوی کی نہ تو تفصیلات ملتی ہیں اور نہ وہ اشعار ہاشمی صاحب نے درج کئے ہیں۔ جو خاص غوث اعظم کے حالات و کرامات سے تعلق رکھتے تھے اس کے بارے میں بس یہی معلوم ہو سکا ہے کہ اس میں شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات زندگی اور کرامات بیاں کی گئی ہیں۔ اس مثنوی میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کی ابتدا حمد و نعت سے نہیں ہوئی۔ بسم اللہ کے بعد ہی مدح شیخ ہے اور اس کے بعد مختلف عنوانات اور حکایات کے تحت بیان کیا ہے۔ چنانچہ اس مثنوی کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی کہ اس میں کس درجہ سوانحی عناصر پائے جاتے ہیں۔

دراصل گلشن عشق۔ علی نامہ۔ یا غوث نامہ کو سوانح یا سیرت نگاری سے منسوب کرنا نہ صرف خوش فہمی ہے بلکہ فاش غلطی ہے البتہ ان سے اتنا اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ اردو کے ابتدائی دور میں کس درجہ سوانح نگاری کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گیارھویں صدی ہجری یا سترھویں صدی عیسوی میں اردو زبان اس قابل ہو چکی تھی کہ وہ شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کے جستہ جستہ مثنویوں اور منظوم صورتوں میں کیا ہے۔ بارھویں صدی ہجری میں بھی دکن میں ہم کو زیادہ ترتیب یافتہ تصور اور عناصر ملتے ہیں ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی مرتبہ "تذکرہ اردو مخطوطات" میں باقاعدہ تاریخ و سیرت و مناقب کے عنوان سے ان مخطوطات کی فہرست

درج کی ہے۔ جن میں کچھ تو حالات و مناقب رسول کریمؐ سے متعلق ہیں۔ اور کچھ آل واصحاب نبیؐ سے ان کے علاوہ محبوب سبحانی اور دوسرے بزرگانِ دین کے حالات اور پھر سلاطین و امرار کے حالات و واقعات بھی ہیں جن میں قصائد اور ہجو یہ نظموں کو بھی شامل کیا ہے۔

مذکورہ فہرست میں درج کی ہوئی کتابوں میں مولود نامہ عبدالملک سنہ تصنیف کے لحاظ سے قدیم ترین کتاب معلوم ہوتی ہے یہ ۱۰۰۹ھ ہجری میں لکھی گئی ہے۔ زبان پہ گجراتی کا اثر نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے سیرت نگاری میں احادیث اور اقوال کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا ہے۔ اور انہی کی مدد سے یہ مولود نامہ تیار کیا ہے۔ کہتے ہیں

مولود حضرت کے لکھے ہیں میں حدیثوں سوں اتار
سن کر اسے کچھ خبر کر جو تجھ دیا پروردگار

اس کے علاوہ دریا نامی ایک مصنف کے دو وفات نامہ۔ سرورِ کائناتؐ بھی ملتے ہیں۔ دونوں کا سنہ تصنیف ۱۱۱۱ھ ہے۔ ایک وفات نامہ سرور کائناتؐ ۵۱۵ ابیات پر مشتمل ایک مثنوی ہے جس کا مصنف امالی ہے اور سنہ تصنیف ۱۱۴۰ھ ہجری ہے

حضور رسول کریمؐ کے سراپا اخلاق و عادات کے اوپر ایک رسالہ شمائل نبیؐ ۱۱۵۸ھ ہجری میں عبدالحمید ترین نے پشتو کے ایک مصنف اخوندرو بزانی کے رسالے سے ترجمہ کیا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور ناقص الطرفین مثنوی کا ذکر ہے جس کا مصنف اور سنہ تصنیف کا علم نہ ہو سکا البتہ کاغذ اور کتابت کے لحاظ سے قیاس کیا گیا ہے کہ ۱۲۵۰ھ ہجری سے قبل کا نسخہ ہے۔ آں حضرتؐ کے ابتدائی حالات زندگی اور دائی حلیمہ کا آپؐ پر پروانہ وار نثار ہونا مذکور ہے۔ اور معجزہ شق صدر تک حال بیان کیا گیا ہے۔ اس کی زبان سادہ اور دلنشین ہے اور اس مثنوی کو بڑی قبولیت حاصل ہوئی اور آج بھی جبکہ بادی دنیا کے بڑے بڑے بارونق شہروں کی کشادہ اور خاموش سڑکوں۔ آرام دہ کوٹھیوں اور مکانوں کے رہنے والے اس کے نام ونشان سے بھی واقف نہیں۔ پیلے پیلے کاغذ پر چھپا ہوا قصہ دائی حلیمہ شہر کے پسماندہ علاقوں کی تنگ وتاریک گلیوں کے چھوٹے چھوٹے شکستہ گھروں میں بسنے والی بھولی بھالی اور معصوم عقیدت رکھنے والی بڑی بوڑھیوں کے جزدانوں میں مختلف دعاؤں اور میلاد دوں کی کتابوں کے درمیان چھپا رکھا ہوتا ہے۔ اور فرصت کے اوقات میں یہ سادہ لوح بڑی بوڑھیاں ہل ہل کر بڑی سادہ اور پُر درد لے میں پڑھتی ہیں۔

گرد پھرتی تھی کبھی سو سو بار　　جیسے ہو شمع پہ پروانہ نثار
کبھی کر بیٹھتی بے ساختہ شور　　چاند کو دیکھ کے جس طرح چکور

اور پھر اپنے میلے اور زرد دوپٹوں میں حسن عقیدت کے جھلملاتے آنسوؤں کو جذب کرتے کرتے اس اختتام پر آپہنچی ہیں۔

جان جائے میرا جانی بچ جائے ۔۔۔ وہ مرا یوسف ثانی بچ جائے
گھوڑے سے بیٹے سلامت جاؤں ۔۔۔ آمنہ کی میں امانت پاؤں

اس دور کی ان دکھنی مثنویوں کے علاوہ جن میں کہ سوانح نگارانہ عناصر پائے جاتے ہیں اور اسی نوع کی دوسری مثنویوں کے علاوہ اردو ادب میں خصوصاً شمالی ہند میں اس انداز کی نظم و نثر کا کوئی نمونہ نہیں ملتا اور اس میدان میں یکسر سناٹا چھایا ہوا ہے۔ اسی جرم و خطا پر اردو ادب کو اس کے بعض نقادوں نے ہدفِ ملامت بنایا ہے اور یہ اعتراض اور تاسف بالکل صحیح ہے کہ ہمارے قدیم ادب میں شاعری اور شاعری میں بھی غزل کے علاوہ کسی دوسری صنف ادب میں کوئی ایسا تخلیقی کارنامہ نہیں ملتا جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکیں۔ لیکن اگر بہ نظر غور اور انصاف دیکھا جائے تو اس میں نہ تو ہماری زبان کی تقصیر ہے نہ ایک حد تک شاعروں اور ادیبوں کی خطا ہے۔ بلکہ ایک خاص ماحول اور سیاسی ابتری کا نتیجہ ہے۔

جہاں تک معلوم ہوا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دکنی دور کے بعد اردو کو کبھی سازگار سیاسی فضا نصیب نہیں ہو سکی۔ دکن میں قطب شاہی عہد اور اس کے کچھ بعد کا زمانہ ہی ایسا زمانہ ہے جس میں ہمیں اردو ادب و شعر میں حقیقی سکون اور مسرت کے آثار ملتے ہیں۔ اور اس کے بعد سے لے کر عالمگیر کے زمانے تک کم کم اور عالمگیر کے بعد سے تو عام ابتری اور افراتفری کا زمانہ ہے جو نومولود اردو شعر و ادب کو ملتا ہے۔ ایک

طرف تو سیاسی ابتری تھی ۔ دوسری طرف انحطاط پذیر عیش و عشرت روز بروز نحوست سے قریب تر لے جا رہی تھی ۔ یہاں تک کہ محمد شاہ رنگیلے کی فاقہ مستیاں رنگ لائیں اور $\frac{۱۷۳۹}{۱۱۵۱ھ}$ عیسوی میں نادر شاہی حملہ ہوا ۔ ملک کی بساطِ سیاست ہر آن الٹی جاتی اور پھر بچھائی جاتی تھی دو شخصوں کی خاطر چند ہزار انسان لڑتے ایک فاتح ہو جاتا ۔ دوسرا مفتوح بظاہر کہانی ختم ہو جاتی لیکن درحقیقت لاکھوں کہانیاں ادھوری رہ جاتیں اس شکست و فتح کو بے گانہ انسان دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ۔ ان کا کاروانِ حیات بار بار لٹ جاتا ۔ ان کے نصب العین اُن کے آدرش کہیں دور جا چھپتے اور زندگی ان سے بار بار روٹھ جاتی وہ زندگی کو مناتے مناتے تھک جاتے ۔ محض جینے کے خاطر جیتے اور کچھ سوچنے سے بھی ڈرتے ۔ حساس اور باشعور دماغ اور ذہن پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں وہ پیدا ہوتے رہے ۔ لیکن اس کا مداوا ان کے بس کی بات نہ تھی ۔ سچ پوچھیے تو مصائب و آلام نے اس خلش کی نوعیت کو سمجھنے کی بھی صلاحیت چھین لی تھی ۔ چنانچہ وہ اس بے سکونی اور اضطراب کو محض دردِ عشق کا نام دے کر اسی کا اظہار کرتے ۔ ان کو صرف ہجر و فراق کی بیتابیوں کے اظہار ہی میں سکون ملتا ۔ حساس اور گہرے شعور کا مالک زندگی کی حقیقتوں سے ڈرا اور سہما ہوا ۔

محض شاعر ہی بن سکتا تھا ۔ جو عشق کے پُر سوز اور گداز واردات قلبیہ کی آڑ لے کر مسائل تصوف کے دامن میں پناہ ڈھونڈھ لیتا ہی

زندگی کی معراج سمجھتا تھا۔ چنانچہ اردو کے اہل قلم اور باشعور شخصیتیں ایک سوگوار فضا اور گھٹاٹوپ اندھیرے میں ٹکریں مارتی رہیں ادب اور زندگی کا چشمہ سوکھتا گیا اور غزل پھولتی پھلتی رہی کیونکہ غزل کا خاص موضوع عشق و محبت کے جذبات کی سرگرمی اور لپک ہے یا پھر تصوف اس دور میں میر کی سوگوار آہ سنائی دیتی ہے۔ میر درد کا تصوف ملتا ہے سودا کی مسکراہٹوں میں بھی آنسو جھانکتے ہوئے ہیں۔ اور ان کے قصائد کے شگفتہ انداز کے باوجود ان کے شہر آشوب میں اس گہرے اور بے پناہ درد کا احساس ملتا ہے جو آگے چل کر ان کا چڑ چڑا پن بن گیا۔ اسی طرح ہم ۱۷۵۷ء میں پہونچتے ہیں انگریزوں کے قدم پلاسی کا معرکہ سر کر کے بنگال میں جم جاتے ہیں اور شاہ عالم سے بہار کا صوبہ خرید کر الہ آباد سے بنگال و آسام تک اپنی حکومت کی توسیع کر لیتے ہیں غرض اس تھا۔ ان حالات اور شام و سحر میں انتشار ایسا رچا ہوا تھا کہ اس کے اندر کسی منظم اور سنجیدہ ادب کا پھولنا پھلنا ممکن ہی نہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک دور اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس دور کے معیار اور آدرش ٹوٹ رہے تھے۔ اور کون نہیں جانتا جب کوئی منفی شے وجود مثبت کی شکل اختیار کرتی ہے تو تخلیق عمل میں آتی ہے۔ اور ہر چیز اس نئے جسم کا استقبال کرنے کے لئے کوئی ہدیہ اور نذرانہ پیش کرتی ہے۔ مگر جب وجود مثبت کی نفی ہوتی ہے تو ایک جمود اور سکوت کی کیفیت ہوتی ہے۔ ہر چیز کسی بات کی منتظر اور ٹھہری ہوئی نظر

آتی ہے۔ چنانچہ ایسی حالت میں سوانح نگاری جیسی سنجیدہ اور منظم صنف ادب کی باقاعدہ تلاش سعی لاحاصل معلوم ہوتی ہے۔ جس کے لئے مصنف کا انتشار ذہنی۔ نفرت یا شدت کم قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ البتہ اس دور میں ہمیں چند غیر شعوری کوشش ضرور ملتی ہیں۔ اور شمالی ہند میں بھی یہ غیر شعوری کوششیں منظوم خصوصاً جن میں سے ایک غیر شعوری کوشش مرثیہ نگاری ہے۔ شہدائے کربلا کے مرثیوں میں جو ان کی بلندی کردار عزم و استقلال اور حوصلہ مندی نیک مقاصد ان کے مشن کی عظمت پر بڑے فنکارانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر ان کے مصائب اور ہر نوع کے رنج والم کی جذبات نگاری۔ اگرچہ کسی شعوری شخصیت اور سیرت نگاری سے منسوب نہیں کی جا سکتی۔ لیکن ہم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ شہید اعظم اور ان کے رفقاء کے حضور میں پیش کئے ہوئے ان نذرانہ ہائے عقیدت و محبت میں سیرت اور کردار کے زبردست اور غیر فانی عناصر موجود ہیں۔ میر انیس نے مرثیہ کو ایک عظیم اور مقبول ترین صنف بنا دیا اور ان کے بعد اس کے موضوع کو زیادہ وسعت دی گئی غالب چکبست و حالی نے بڑے معرکے کے مرثیے لکھے ہیں۔ جن میں سیرت نگاری حقیقت پسندی اور نفسیاتی اثر انگیزی زیادہ واضح طور پر نظر آتی ہے۔ کیونکہ شہدائے کربلا کے مراثی میں وزن اور بحر عقیدت اور حصول ثواب کے پیش نظر شخصیت نگاری کو زیادہ حقیقی بنانے کی کوشش کی گئی۔ اسی طرح مختلف ادبائے کرام کے طریقہ ہائے

عبادت اور ان کے اوراد اور وظائف کے ذکر میں ضمنی طور پر ان کی زندگی اور طور و طریق کا بھی بیان ہے اور اس طرح انہی کتابوں میں سیرت نگاری کی اولین بنیادیں مل جاتی ہیں اور اس طرح ہمارے لکھنے والے غیر شعوری طور پر سوانح نگاری کی داغ بیل ڈالتے جارہے تھے اور سیرت اور شخصیت نگاری کا وہ بیج جو ابتدا ہی سے اردو کی بنجر زمین میں ڈال دیا گیا۔ اب آہستہ آہستہ اس میں اکھوا پھوٹ رہا تھا۔ بلکہ اب وہ سر ابھار رہا تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شمالی ہند میں تذکروں کا ایک سلسلہ ہے جس سے ہم اردو شعراء کے ناموں، کلام اور ان کے مذاق شعری کا ایک خفیف سا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مشہور فرنچ مستشرق گارساں دتاسی نے اپنے ایک خطبہ میں ان تذکروں پر جہاں تک اس کی معلومات نے ساتھ دیا ہے۔ تفصیل سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

"اہل ایران اور ان کے تتبع میں ہندی مسلمان سوانح (خاص کر ہم عصر لوگوں کے سوانح) لکھنے کے بہت شوقین تھے۔

"اور جیسا کہ ہمارے ہاں کا حال ہے ان میں صرف تاریخ وفات مفقود نظر آتی ہے۔ لیکن یہ تذکرے تجارتی مفاد کے ادب کا اہم جزو ہیں۔ ان تذکروں میں مشہور مولفین اور دوستوں کی مدح

سرائی دل کھول کے کی جاتی ہے اور اس حیلے سے انھیں اپنی فصاحت اور بلاغت اور انشار پردازی دکھانے کا خوب موقع ملتا ہے اور عمدہ اشعار انتخاب کر کے اپنے ذوق سلیم کا اظہار کرتے ہیں۔
(خطبات گارساں وتاسی صفحہ ۵۵)

۲۔ گارساں وتاسی کے اس بیان کی روشنی میں یہ صاف ہو جاتا ہے کہ ان تذکروں کے لکھنے کا مقصد سوانح نگاری نہ تھا بلکہ لکھنے والوں کے پیش نظر دو باتیں تھیں اول تو اپنی فصاحت اور بلاغت دکھانے اور انشا پردازی کا اظہار دوئم یہ کہ شعرار اپنی بیاضیں رکھتے تھے جن میں ہمعصر شعرار کے نمونہ ہائے کلام کے ساتھ ساتھ اپنی رائے اور پسند کا اظہار بھی کر دیتے تھے اور اس ضمن میں کبھی کبھی ایک آدھ سطر یا چند الفاظ شاعر کی ذات کے متعلق بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے تذکرہ نگاروں کے پیش نظر محض اپنی ذاتی یادداشت اور اپنی خوش وقتی تھی ان کو نہ تو اس شاعر کی ذات سے دلچسپی تھی جس کے شعر ان کو اس درجہ محظوظ کرتے تھے کہ وہ ان کو محفوظ کئے بغیر نہ رہ سکے نہ آئندہ کسی دوسرے کی معلومات میں اضافہ کرنے کا خیال تھا۔ انھوں نے انسانی شخصیت اور سیرت کو قطعاً قابل اعتنا نہیں سمجھا ہے اور بعض اوقات تو اس معاملے میں بڑے بخل سے کام لیا ہے۔ مثلاً مصحفی۔ عشقی مرادآبادی کے متعلق اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کہنا چاہتے کہ "عشقی مرادآبادی فقیر واہل دیدہ

بودو بہ شعر خط وا فرو داشت ، اسی طرح میر صاحب اپنی نکات الشعرار میں جو کہ دراصل سیرت نگاری کے لحاظ سے اس دور کا اہم ترین تذکرہ ہے ۔ اور اس میں پیش کئے ہوئے نقشے مختصر ہونے کے باوجود مکمل ترین ہیں اور بعض شعرار کے حالات کے بیان کے ساتھ ساتھ ماحول پہ بھی روشنی ڈالی ہے ۔ اس طرح شخصیت نگاری میں جان ڈال دی ہے ۔ اس معاملے میں بعض وقت بے پروا اور بے نیاز سے ہو جاتے ہیں ۔ اگرچہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب ۔

" نکات کا شاندار ترین وصف اس کی سیرت نگاری ہے "

۴ - پھر بھی جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ آزاد کے متعلق " ہم عمرو لی بودو بسیار معصفاً حرف می سازد " سے زیادہ کچھ اور کہنا مناسب نہیں سمجھتے تو میر صاحب سے ایک شکایت سی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ انسانی زندگی کو اتنا ناقابل اعتنا کیوں سمجھتے تھے ۔ انھوں نے آخر افرنس اینڈرسن کی طرح کیوں نہ سوچا کہ ۔

" ہر انسان کی زندگی پریوں کی ایک کہانی ہے جو خداوند نے خود لکھی ہے "

لیکن جونہی ہمیں ان کے ناسازگار حالات کا خیال آتا ہے تو ہم سوچتے ہیں کہ وہ اس سنو وائٹ اور سنڈریلا کی جداگانہ دنیا تخلیق کرنے والے تخیل پرست رومانی کی طرح کیسے فراموش

کر سکتے تھے کہ اس دنیا میں بہت دکھ ہیں بڑی تکلیفیں ہیں اور انسان اور زندگی دونوں بھول جانے کی چیزیں ہیں۔ فارسی تذکروں کی یہ اچھی خاصی کثیر تعداد ہی اردو تذکرہ نگاری کی پیش روٹھہری اور اسی وجہ سے ان کا ذکر لازمی اور ضروری ہے اور بقول کلیم الدین احمد صاحب کے اس تبصرے کے باوجود۔

"غرض یہ حالات مختصر ہوں یا مفصل : تذکرہ نویسوں میں یہ قدرت نہیں کہ ان واقعات کو اس طرح بیان کریں کہ شاعر کی تصویر میں جان پڑ جائے۔"

۴۔ یہ تذکرے اہم اور قابل توجہ ہیں۔ ان میں بعض اوقات شعراء کے کلام پر بڑی اچھی تنقیدوں کے علاوہ اکثر شخصیتوں کا حسن موجود ہے اشاروں ہی اشاروں میں بڑی بڑی تفاصیل ظاہر کر دی ہیں۔ اور پوری شخصیت پیش کر دی ہے۔ جب ہم ان تذکروں کو Mark Longaker کے الفاظ کی روشنی میں جانچتے ہیں تو اور بھی کم اعتراض کا موقع رہ جاتا ہے Longaker نے English Biography in the 18th century۔ میں لکھتا ہے۔

"تذکرہ رجال میں مصنف کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اشخاص کی زندگی اور واقعات ایسے پر معنی ایجاز واختصار سے بیان کرے جس سے ان اشخاص کی پوری

سیرت آنکھوں میں پھر جائے۔

۵۔ یہ ایجاز اور اختصار اس وجہ سے اور بھی گوارا ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سوانح نگاری کے عناصر کے بجائے بیاگرافیکل ڈکشنری اور قاموس اور تراجم کا ایک موہوم سا تصور ملتا ہے اور مذکورہ اصناف میں سوانح نگاری کے برعکس جو کہ فرد کے پھیلے ہوئے حالات پر مشتمل ہوتی ہے۔ زیادہ تفصیل کو عیب میں شمار کیا جاتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ تذکرے زیادہ قابل اعتراض نہیں ہیں ان سے چند فائدے بھی ہوئے ان تذکروں کے وجود نے یہ احساس دلایا کہ امراء و سلاطین کے علاوہ ادبی شخصیتوں کے نام اور حالات بھی محفوظ کرنے کی چیز ہوتے ہیں۔ اور اسی شوق نے تبدریج ان کی نجی اور گھریلو زندگی میں بھی جھانکنے کا شوق دلایا۔ اور بقول شجاع احمد زیبا صاحب

• اگر یہ تذکرے نہ لکھے گئے ہوتے تو نہ معلوم آبِ حیات جیسی تصنیف کو عالم وجود میں آنے میں کتنا عرصہ لگتا۔•

۶۔ ان فارسی تذکروں کے علاوہ گارساں دتاسی کی تحقیق کے مطابق چھ اردو تذکرے بھی ہیں جن کو اس نے ہندوستانی زبان کے تذکرے لکھا ہے سب سے پہلا تذکرہ گلشن ہند۔ مرزا علی لطف کا لکھا ہوا ہے۔ (۲) دیوان جہاں بینی نرائن جہاں کا ہے۔ مگر اس کو تذکرہ نہیں کہا جا سکتا۔ (۳) چار گلشن امام بخش صہبائی کا۔

(۴) انتخاب دواوین جس میں شعراء کے مختصر حالات درج ہیں۔ (۵)
صحف ابراہیم۔ سراپا سخن محسن لکھنوی۔ طبقات الشعراء مولوی کریم الدین
اور مسٹر ایف فیلن۔ ان تذکروں کو بھی اسی فارسی نہج پہ چلایا گیا ہے
اور یہ عام طور پر تین اجزاء پر مشتمل ہوتے ہیں۔

۱۔ شاعر کے مختصر حالات

۲۔ تبصرہ کلام

۳۔ انتخاب۔

۷۔ مرزا علی لطف کا تذکرہ گلشن ہند اپنی نوعیت کے اعتبار سے کافی اہم ہے۔ اس کی تکنیک اور فن دوسرے تذکروں کی بہ نسبت زیادہ پھیلے ہوئے اور واضح ہیں۔ اگرچہ مرزا علی لطف نے اس کو گلزار ابراہیم۔ علی ابراہیم خاں کے تذکرے شعرائے ہند سے جان گلکرائسٹ کی فرمائش پر ترجمہ کیا ہے لیکن اس کو محض ترجمہ کہنا ناانصافی ہے مرزا صاحب نے اس کو ذاتی معلومات واقفیت اور چھان بین سے مرصع کر کے بڑا جاذب اور بیش قیمت بنا دیا ہے ان کے بیانات مستند اور مبنی بر حقیقت ہیں۔ البتہ ان کے یہاں قلبی تعلق اور لگاؤ یا دوری اور بیگانگی کے آثار ملتے ہیں۔ مثلاً حاتم کا ذکر محض چند سطروں ہی میں کر کے ختم کر دیا ہے۔ اور بیش اشعار کا نمونہ دیا ہے

۸۔ ابوالحسن تاناشاہ کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے اور ایسے پیرائے میں کیا ہے کہ اس کے عادات و اطوار اور مشاغل سے اچھی خاصی واقفیت

پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بشیر علی افسوس کا ذکر کرتے وقت وہ اپنے دلی جذبات کو فراموش نہ کر سکے البتہ اس لگاؤ اور تعلق میں سچائی کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ اور مرزا صاحب کی اس سچائی اور حلیمی نے لون جانئی سن کی یہ شرط کہ "انسان اور دیوتا میں سچائی اور حلیمی ہی قدر مشترک ہے" پوری کردی ہے۔ انھوں نے آصف الدولہ کی دل کھول کر تعریف کرنے کے باوجود یہ کہنا مناسب سمجھا کہ۔

"افسوس ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی نائبوں کے ہاتھ میں احکامات ملک کا سرانجام رکھا آپ سیروشکار سے کام رکھا"

۹۔ غرض کہ ان کے اس نوع کی شخصیت نگاری اور تصویر کشی سے ان کے موضوعات کی زندگی کے مختلف راستے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اور اس طرح پہلی مرتبہ اردو میں ہم کو سوانح نگاری کے موضوع کے ساتھ جذبات اور خلوص کا خوشگوار امتزاج نظر آتا ہے۔

۱۰۔ گلزار ابراہیم اور مرزا علی لطف کے مترجمہ گلشن ہند کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ اردو تذکرہ نگاری بھی بالواسطہ انہی رجحانات کو قبول کر رہی تھی۔ جو فورٹ ولیم کالج میں انگریزوں کی زیرنگرانی اردو پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ اور دوسری اصناف ادب کے علاوہ اردو کی نوخیز تذکرہ نگاری کی بنا بھی اب تحقیق

اور تفصیل پر رکھی جارہی تھی۔ اور ان نقائص کی اصلاح کی طرف بھی
خاص توجہ دی جارہی تھی۔ جو قدیم تذکروں میں بڑی طرح کھٹکتے ہیں
یعنی بے جا اختصار جانب داری نفرت یا عقیدت کے جذبہ سے
بیانات و تبورات کو اب دور کرنے کی کوشش کی جارہی تھی

۱۱۔ اب ہمیں تذکروں کی تین اقسام نظر آتی ہیں یعنی (۱) وہ تذکرے
جو تحقیقی اور تاریخی رجحان کے ماتحت لکھے گئے۔ (۲) زبان اردو
کی امکانی تحقیق سے متعلق تذکرے جن میں علاوہ لسانیاتی تحقیق
کے مختلف ادوار میں مختلف اصناف سخن کی ترقی کے اسباب اور فن
تذکرہ نویسی کی تنقید کا زور دیا ہے (۳) وہ تذکرے جن کو ادبی تاریخ
کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے اور جس کے رجحانات
کی آئینہ دار مولانا محمد حسین آزاد کی آبِ حیات ہے۔

• گلزار ابراہیم یا گلشن ہند کا رجحان تاریخی اور تحقیقی ہے۔ جس
کی چند بڑی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ شعرائے مذکور کی تاریخ وفات کا تعین اور حالات زندگی
۲۔ خط و کتابت کے ذریعہ واقعات زندگی کی فراہمی۔
۳۔ معاصرین کے حالات میں ان کے خطوط کے اقتباسات
۴۔ کلام کے مفصل نمونے۔

۱۲۔ تذکرہ نویسی کی دوسری قسم کے متعلق مولوی کریم الدین
صاحب کا "طبقات الشعرار" ہے۔ جس میں انھوں نے لسانیاتی

اور محققانہ تحقیق و تبصرے پر زیادہ زور دیا ہے اور اس لئے یہ تذکرے ہمارے موضوع بحث سے خارج ہیں

ابھی ہمارے اردو تذکرے ان نئے رجحانات سے دوچار ہو ہی رہے تھے اور ان تجربات کو بہت ڈر ڈر کر آزما رہے تھے۔ کہ اچانک اردو کے مایہ ناز انشاپرواز محمد حسین آزاد کے قلم نے اس گومگو اور ہچکچاہٹ کا فیصلہ کر دیا اور ۱۸۸۰ء عیسوی میں ان کی زبردست تصنیف آب حیات شائع ہوئی جس نے اعلان کر دیا کہ رجحانات اور عناصر اب امر مسلمہ اور مستقل طرز بن چکے ہیں۔ آب حیات نے تذکرہ نگاری کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دی۔ اردو ادب کی اس تصنیف کا جدید نسل آج تک بڑی گرمجوشی سے استقبال کرتی ہے۔ یہ کتاب اردو اور فارسی دونوں ہی زبانوں کے لئے اپنے انداز اور پائے کے لحاظ سے نئی چیز تھی۔ اس کی نثر کی سادگی چھوٹے چھوٹے فقرے لطیف رنگ آمیزی تیکھی عبارت اور شوخ و لطیف طرز بیان نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

۲۔ اگرچہ آب حیات کا بنیادی مقصد تاریخ ادب تیار کرنا تھا۔ لیکن اس میں شخصیت نگاری کے عناصر اس درجہ بحت مندانہ ورت میں ملتے ہیں۔ کہ ہم اس کو قدیم و جدید سیرت اور شخصیت نگاری کی عبوری کڑی کہہ سکتے ہیں۔ آب حیات بذات خود ایک پورا دور ہے۔ اور یہی وہ تصنیف ہے۔ جس کے مصنف کو پہلی دفعہ اس نقص کا احساس ہوا کہ قدیم سوانح عمریوں میں ناموروں کی صحیح سرگزشت نہیں معلوم

ہوتی چنانچہ لکھتے ہیں۔

"نہ ان کے عادات اور اطوار کا حال لکھا جاتا ہے نہ ان کی موت وحیات کے سین متعین کیے جاتے ہیں۔ اگر شاعر ہیں تو ان کے کلام کی خوبیوں اور خامیوں پر حقیقی تبصرہ نہیں، نہ انکا ان کے معاصرین کے ساتھ مقابلہ و موازنہ موجود ہے"

(آب حیات صفحہ ۳)

چنانچہ آزاد نے اس کے تدارک کی کوشش کی اور اپنی تصنیف جاندار مرقع تفصیل سے پیش کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اور اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"جہاں تک ممکن ہو اس طرح کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی چلتی پھرتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انھیں حیاتِ جاوداں حاصل ہو۔"

(آب حیات صفحہ ۴)

غرض اس ارادہ اور خیالات کو پیش نظر رکھ کر آزاد نے شعرا کے بڑے دلچسپ اور دلکش مرقعے کھینچے ہیں۔ اور اپنے موضوعات کی بڑی اچھی تصویریں پیش کی ہیں۔ اور بعض وقت ان تصویروں میں رنگ بھرتے بھرتے حقیقت کو افسانے اور تخیل کی دنیا بنا کر رکھ دیا ہے۔ میر صاحب کے حالات اور مزاج کے سلسلہ میں میر صاحب کا لکھنؤ میں وارد ہوتے ہی مشاعرے میں شرکت کرنا اور

پھر اہلِ لکھنؤ کا ان کی وضع قطع پہ ہنس ہنس کر ان کی تعریف اور وطنیت کے متعلق استفسار یہ واقعہ بڑے پر اثر الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے لباس اور وضع کی ایسی اچھی تفصیل دی ہے کہ میر صاحب اور ان کے زمانے کے لباس کا بڑا واضح تصور سامنے آ جاتا ہے۔ لیکن جدید تحقیق کے مطابق یہ واقعہ بے بنیاد ثابت ہوا ہے۔ اور یہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ۔

"افسوس ہے کہ مولانا نے تاریخ کو دلچسپ بناتے بناتے کہیں کہیں واقعی "افسانہ تراشی" فرمائی ہے۔"

(شعرائے اردو کے تذکرے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ صفحہ ۷۶)

تاہم یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ان کے یہاں سیرت و سوانح کے بڑے بالغ اثرات اور تصورات ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تصویر اور مرقعوں کو کامیاب بنانے کے لئے ان اجزاء سے مدد لی ہے جو کسی کے مختصر سوانح اور مزاج پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ مثلاً میر صاحب کے حالات کے سلسلہ میں وضع اور لباس کے بیان سے وہ ان کو مجسم ہمارے سامنے لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔

پھر وہ ان کی تصویر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"میر صاحب میانہ قد لاغر اندام گندمی رنگ تھے ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ بات بہت کم وہ بھی آہستہ آواز نرمی اور ملائمت ضعیفی نے ان سب صفتوں

کو اور بھی قوی کیا تھا۔ کیونکہ سو برس کی عمر آخر ایک اثر رکھتی ہے
ہے۔ (آب حیات صفحہ ۳۱۳)

اس کے علاوہ انھوں نے جہاں ان کی خودداری اور اعلیٰ دماغی کو سراہا اور پیش کیا ہے ساتھ ہی ان پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ اور کہیں ان کی بعض باتوں کو بے اعتدالی سے تعبیر کیا ہے۔ کہیں حد سے بڑھی ہوئی آزادی طبع کو خود پسندی کہا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی بے دماغی جس کے متعلق واقعات بھی بیان کئے ہیں۔ پھر ان کی ظرافت اور لطائف وغیرہ سے ان کی تصویر کو ابدیت اور دلکشی عطا کی ہے۔ اور یہی وہ تکنیک ہے۔ جس کو حالی نے انتہائی ربط اور سنجیدہ متانت اور سلیقہ مندی سے یادگار غالب میں ایک بڑے اور زبردست کینوس پر پھیلا دیا ہے۔

اسی طرح انھوں نے سید انشاء اللہ خاں کے مزاج صورت شکل اور لباس عادات و اطوار کے علاوہ ان کی زندگی کے وہ تین مختلف دور جو سعادت یار خان رنگین نے لکھے تھے بیان کرنے میں اپنے قلم کا تمام حسن اور جذبہ صرف کر دیا ہے اور اس طرح اس بدنصیب شاعر کی زندگی ایک فلم کی طرح ہمارے سامنے آ کر کبھی ہنساتی ہے کبھی سرد آہ بھرنے پر مجبور کرتی ہے۔ غرض کہ مولانا آزاد نے تمام شعراء کے حالات زندگی اور مرقعوں کو کچھ تو اپنی معلومات کے سہارے اور کچھ زود قلم اور تخیل کے بھر دیے پر بڑے دلنشین

اور تفصیل پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ آبِ حیات تو سوانح نگارانہ مقاصد
کے پیش نظر لکھی گئی تھی۔ اور نہ ہم اس کو سوانح میں شمار کر سکتے ہیں۔ پھر بھی
اس کو سوانح نگاری کے قدیم اور جدید طرز اور تصور کی ایک عبوری کڑی
کہا جاسکتا ہے۔

دراصل "تذکرہ نگاری ایک بڑی نازک اور پیچیدہ صنف
ادب ہے جس قدر ادبی تنقید سے متعلق ہے اسی قدر سیرت نگاری سے بھی
قریب ہے۔ اس کے لئے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ

"واقعہ یہ ہے کہ تذکرۃ الشعرا کو سب سے پہلے سیرت
ہونا چاہئے اور پھر لٹریری ہسٹری اسی طرح اس کا خالصۃً
کتاب النقد ہو جانا بھی درست نہیں۔ تذکرہ فن سیرت
کی ایک شاخ ہے، (شعرائے اردو کے تذکرے صفحہ ۹۴)

اور آبِ حیات نے ان شرائط کا پورا پورا لحاظ رکھنے کی کوشش
کی ہے۔

آبِ حیات اور اس کے قبل کے تذکروں سے اس امر کی وضاحت
ہوتی ہے کہ ہماری قدیم تذکرہ نگاری اور سوانح نگاری پر مشرقی اور خصوصاً
ہندوستانی تہذیب اور اخلاق کی چند پابندیاں اور اصول اثر انداز
رہے ہیں۔ جن کی وجہ سے اس نے ایک جداگانہ طرز اور تصور اختیار
کر لیا تھا۔ چنانچہ اس کے چند اصول مقرر ہو گئے اول تو ہمارے سوانح
نگار اور تذکرہ نگار "خطائے بزرگان گرفتن خطا است" کے قائل

تھے۔ بزرگوں کے عیوب کو ظاہر کرنا اور ان پر نکتہ چینی کرنا ان کے نزدیک غیر مستحسن فعل تھا ان کے خیال میں کمزوریوں اور لغزشوں سے زیادہ انسانی شرف وکمال کا اظہار زیادہ بہتر طریقہ تھا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا۔ لوگ بزرگوں کی کمزوریوں اور غلطیوں سے جواز حاصل کر کے اپنی غلطیوں اور کمزوریوں پر فخر کریں گے لیکن اس نظریے کے باوجود ان تذکرہ نگاروں کی یہ کوشش رہی تھی کہ بہت انصاف غیر جانب داری سے کام لیں اور اپنے بزرگوں کو انہی اوصاف سے یاد کریں جن سے وہ متصف تھے۔ اس کے علاوہ یہ تذکرہ نگار اپنے مخالفین کا ذکر بھی بڑے ادب سے کرتے تھے۔

اگرچہ ہماری قدیم سوانح نگاری ان وسعتوں اور تنوع کی حامل تھی جو جدید سوانح نگاری کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تاہم اس کے لیے بجا طور پہ کہا گیا ہے کہ

"بہر حال مشرق اس سعادت مندی پہ نازاں ہے کہ وہ گستاخانہ حقیقت نگاری سے بچا ہوا ہے اور اس کے فرزندان کا قلم اپنے ناموروں کی تصویریں اس عمدگی سے کھینچتا ہے کہ اصلی خد وخال کی بدنمائیاں بھی دور ہو جاتی ہیں۔

(شعرائے اردو کے تذکرے۔ صفحہ ۱۰۳)

تیسرا باب

حالی اور ان کا فن سوانح نگاری

ہر قوم اور زبان کا ادب وقت۔ اور ماحول کے تقاضوں کے ساتھ مختلف حالتوں سے دوچار رہتا ہے اور جہاں ادب پر ایک دور ایسا آتا ہے کہ اس پر سکوت اور جمود طاری ہوتا ہے۔ اس میں کسی اقدام اور فعالیت کی کوئی صورت نہیں پیدا ہوتی۔ ادیب و شاعر بس یونہی کچھ نہ کچھ گڑھتے کے پیش نظر بنے بنائے سانچوں میں ایک ہی ساڈھلا ڈھلایا معطل اور بے جان ادب پیش کرتے رہے ہیں بے شمار نمونے سامنے سے گزر جائیں گے۔ مگر ادیب کوئی امتیاز اور فرق کرنے سے قاصر رہیں گے۔ اسی طرح ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ ادب کی اقدار ہر آن بدلتی ہیں۔ اور لکھنے والے ہر لحظہ کوئی نہ کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ خلائیں اور اندھیرے ہیں

تحریص ملا نے والے ادیب اپنی منزلیں معین کرتے ہیں ۔ نئی روشنیوں میں اپنی راہیں تلاش کرتے ہیں ۔ اس طرح ادب کا فرسودا اور خزاں رسیدہ درخت نئی بہاروں سے آشنا ہوتا ہے ۔ اس میں نئے برگ و بار آتے ہیں ۔ نرم و نازک اور نئی نئی کونپلوں کے درمیان حسین کلیاں مسکراتی ہیں ۔

اردو ادب کا نوخیز پودا سر اٹھاتے ہی خزاں آشنا ہو گیا ۔ ابھی پوری طرح پھولنے پھلنے بھی نہ پایا تھا کہ سیاسی اور اقتصادی انتشار کی باد سموم نے اس کو کملا دیا ۔ سسکتی اور بلکتی زندگی نے ادب کو لاکھ سہارا دینا چاہا لیکن یہ پودا سرنگوں ہی رہا ۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب ابر نیساں بن کر آیا اور کچھ اس طرح برسا کہ وہ تناور درخت جن کی جڑیں سوکھ کر کھوکھلی ہو چکی تھیں ڈھے گئے ۔ لیکن جن میں ذرا بھی سکت باقی تھی وہ جی اٹھے ۔ اور ان پر بہار آگئی چنانچہ اردو ادب نے بھی نئی زندگی پائی ۔ اس کی نخل بندی اور آبیاری کرنے والے سرسید اور ان کے رفقا میں حالی کا نام ہمیشہ احترام اور عقیدت سے لیا جائے گا ۔ خصوصاً اردو سیرت نگاری حالی کا نام فراموش نہیں کر سکتی ۔ وہ اس آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے مدھم ستاروں کے درمیان درخشاں ماہتاب کی طرح نظر آتے ہیں ۔ حالی بلا اختلاف رائے اردو سیرت نگاری کے بانی ہیں ۔ اگرچہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ حالی نے جس وقت اس صنف ادب پر قلم اٹھایا تو اس وقت یہ

میدان بالکل خالی تھا۔ کیونکہ اس وقت بھی سیرت اور اسوۂ رسولؐ پر برابر خامہ فرسائی کی جا رہی تھی۔ لیکن ان کے طرز اور ڈھنگ کا اندازہ ہم مرزا حیرت کے اس دیباچے سے کر سکتے ہیں جو انھوں نے سیرت محمدیہ میں لکھا ہے۔ مرزا حیرتؔ حالیؔ کے معاصر ہیں اور حالی کے فن سوانح نگاری سے متاثر ہیں۔ اور ان ہی کا تتبع کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ ہم اپنے سچے نجات دہندہ
کی آنکھ بھوؤں کی تعریف کے ورد کو بلائے طاق رکھیں
اور اس کی سچی تاریخی صفات سے بحث کر کے جبراً
اس کی حقیقت عالم پر ثابت کر دیں۔"

مرزا حیرت کے بیان سے اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ اس وقت سوانح رسولؐ جیسی روشن اور واضح چیز جس کے ہیرو کے کردار اور گفتار کا ایک ایک لفظ محفوظ اور قلم بند کر لیا گیا تھا۔ کی تصنیف میں بھی ہمارے مصنفین آنکھ بھوؤں کی تعریف سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ اور ان کی کرداری صفات کو مطلق قابل اعتنا نہ سمجھتے تھے۔

بہر صورت اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سوانح نگاری کو بطور ایک خاص فن کے حالی نے اپنایا اور اس کے واضح اور جدید نقوش انھوں نے ہی نمایاں کئے انھوں نے

اس صنف ادب کی تہی دامنی کو پوری طرح محسوس کیا اور حیات سعدی کو لکھ کر اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ اسی پر اکتفار نہیں کی بلکہ یادگار غالب اور حیات جاوید لکھ کر اردو سوانح نگاری میں ایسے بیش قیمت اضافے کئے۔ جن کی قدر و اہمیت سے آج بھی انکار نہیں کیا جا سکتا

اردو ادب کے اس محسن کی پیدائش پانی پت کے قصبہ میں ۱۸۳۷ء میں ہوئی اور وہیں قدیم رواج کے مطابق تعلیم و تربیت پائی اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ دہلی میں مشرقی علوم کی تحصیل میں مشغول رہے اور دہلی کالج کی طرف متوجہ ہوئے۔ دہلی میں مرزا غالب۔ استاد ذوق۔ شیفتہ اور مولانا آزاد سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ انہی کی صحبتوں سے حالی کے مذاق شعری نے تربیت پائی۔ حالی کی تحریروں اور مزاج میں شیفتہ کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ اور شیفتہ کے فیض صحبت نے ان کے اندر حقیقت پسندی اور سادگی کی صفت پیدا کی۔ مولانا عربی ادب کا بڑا شستہ مذاق رکھتے تھے۔ اور ان کی تحریروں میں عربی اشعار و اقوال کی موجودگی ان کی عربی ادب کے علمیت کی غمازی کرتی ہے۔

حالی نے ۱۸۵۷ء کی تحریک بغاوت کا مشاہدہ کیا تھا اور اس انقلاب نے ان کے اندر زبردست تبدیلی پیدا کی تھی۔ اگرچہ یہ تغیر براہ راست نہ ہوا تھا بلکہ بالواسطہ ان کی زندگی میں سرسید کی

اہم اور باعظمت شخصیت کی وساطت سے داخل ہوا سائنٹفک سوسائٹی کی شرکت اور سرسید سے متعارف ہونے سے قبل مولانا حالی لاہور میں انجمن پنجاب اور کرنل ہالرائیڈ سے روشناس ہو چکے تھے اور جدید خیالات اور انگریزی ادب کا تھوڑا بہت تصور رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ سرسید سے ملے تو بہت جلد ان کے جذبات اور خیالات کی عظمت اور گہرائی کا اندازہ ان کو ہو گیا۔ ان کی ہر بات کی اہمیت کا ان کو بخوبی اندازہ ہو گیا۔ اور وہ بہت جلد ان پر ایمان لے آئے۔ سرسید سے ان کی والہانہ شیفتگی اور عقیدت کا اس فارسی شعر سے ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے مسدس کے دیباچہ میں ان کی طرف اشارۃً لکھا تھا۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبروجواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بایک نگاہے

حالی نے جس طرح سید صاحب کو دیکھا اور پرکھا ہے اس کی مثال حیاتِ جاوید میں ملتی ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح سید صاحب کی ادنیٰ سے ادنیٰ اور بڑی سے بڑی بات سے واقف تھے ان کے ہر جذبے اور فعل کو اپنی کے ذہن و نظر کی روشنی میں دیکھتے تھے۔

اگرچہ مولانا حالی کا طرز نگارش بڑی حد تک سرسید اور اس زمانے کے مغربی رجحان سے متاثر ہے اور ان کی تمام تحریروں میں

ایک ہی جذبہ اور مقصد کارفرما ہے یعنی سرسید کے مشن اور خیالات کا ابلاغ۔ لیکن ساتھ ہی اس میں خود ان کے مزاج اور افتاد طبع کی جھلکیاں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ خواہ مقدمہ شعر و شاعری ہو یا ان کی سوانحی تصنیفات ہوں یا کوئی دوسری تحریر۔ اس میں ایک خاص توازن نرمی اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ قسام ازل نے حالی کو سنجیدہ متین اور ہمدرد دل و دماغ عطا کیے تھے وہ بڑی دھیمی اور بردبار طبیعت کے مالک تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خمیر بڑی معتدل مٹی سے ہوا تھا۔ ان کی تحریر کی دردمندی سلامت روی اور توازن اس بات کے شاہد ہیں کہ ان کی افتاد طبع سوانح نگاری کے لئے عین مناسب اور موزوں تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی سوانح نگاری میں چند اصولی اور فنی خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کے فن کے عیوب و محاسن کے جائزہ اور محاکمہ سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ ان جدید تصورات سے کس حد تک روشناس تھے۔ اور ان کا طریق کار کیا تھا انھوں نے اپنے تصورات اور اس کے بارے میں واقفیت کا اظہار اپنی پہلی سوانحی تصنیف حیات سعدی میں کیا ہے چونکہ اس صنف ادب میں یہ پہلا شعوری اقدام تھا لہٰذا اس کی تعریف اور تعارف سب سے پہلے کرایا ہے اور جہاں تک ہو سکا ہے اس کی جامع تعریف کر کے اپنے اہل زبان حضرات کو جدید ہوگرانی سے مانوس اور روشناس کرا دیا۔

پھر انھوں نے مشرق کے تصور سوانح نگاری کے متعلق لکھا ہے

اور اس بات کو واضح گیا ہے کہ ظہورِ اسلام کے بعد اہل عرب نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور حیات اقدس کے محفوظ اور مجتمع کرنے میں جس احتیاط اور تحقیق سے کام لیا ہے وہ نہ صرف قابل تحسین ہے۔ بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔ ان کو افسوس ہے کہ سیرت اور سوانح رسولؐ کے علاوہ انھوں نے اس طرف توجہ نہیں دی۔

"باقی علماء اور شعراء وغیرہ کے تذکرے ایسے نہیں اور چونکہ تذکرہ نویسی کا مدار محض نقل نویسی پر تھا اس لیے ان لوگوں کے سوا جن کے حالات تاریخ میں مفصل لکھے گئے ہیں جیسے خلفاء وسلاطین وزراء اور سپہ سالار وغیرہ باقی تمام اہل کمال کے حالات مختصر طور پر لکھے گئے ہیں۔ اور مشہور سے مشہور مصنف کی لائف بھی جداگانہ نہیں لکھی گئی۔"

(دیباچہ حیات سعدی)

اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ اپنے اصل موضوع یعنی جدید بائیوگرافی پر آتے ہیں اور اس کی تعریف اور ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ حیات سعدی کے دیباچے سے اخذ کردہ ان اقتباسات کے لئے معافی مانگتے ہوئے مزید اقتباسات کی ضرورت اس لئے محسوس ہو رہی ہے کہ اس طرح مولانا حالی کا اپنا نظریہ اور تصور جو وہ سوانح نگاری کے متعلق رکھتے تھے۔ واضح ہوجائیگا اور یہ بھی معلوم ہوجائے

کہ وہ اس کو کس مقصد کے لئے کار آمد جانتے تھے۔ اور اس سے کس قسم کا کام لینا چاہتے تھے اور جدید سوانح کے کس پہلو کو زیادہ قابل اعتنا سمجھتے تھے ایک جگہ پر لکھتے ہیں۔

"بیوگرافی ان بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے
جنھوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات
اور نیکیاں پھیلائی ہیں۔ اور جو انسان کی آئندہ نسلوں
کے لئے اپنی مساعی جمیلہ کے عمدہ کارنامے چھوڑ گئے ہیں"

یہاں پر اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ وہ بیاگرافی کو اصلاحی اور اخلاقی مشن کی ایک کڑی سمجھتے تھے۔ ان کے پورے دیباچہ سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ بیوگرافی ایک افادی صنف ادب ہے۔ جس کے فواید حسب ذیل ہیں۔

۱۔ بیوگرافی تازیانہ عبرت ہے۔
۲۔ اس سے سوئی ہوئی پسماندہ قوموں کی رگ حمیت بیدار ہوتی ہے۔
۳۔ اس سے نیکی کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔
۴۔ اچھائی برائی میں تمیز ہوتی ہے۔
۵۔ اس کا مطالعہ بڑے بڑے کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

مذکورہ بالا نتائج کے جواز کے لئے ان کے دیباچے کے ان دو اقتباسات کا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

خصوصاً جو قومیں علمی ترقیات کے بعد پستی کے درجہ کو پہونچ جاتی ہیں۔ ان کے لئے بیاگرافی ایک تازیانہ ہے جو ان کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے" (حیات سعدی)

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

بیوگرافی علم اخلاق کی نسبت ایک اعتبار سے زیادہ سودمند ہے۔ کیونکہ علم اخلاق سے صرف نیکی اور بدی کی ماہیت معلوم ہوتی ہے اور بیوگرافی سے اکثر نیکی کے کرنے اور بدی سے بچنے کی نہایت زبردست تحریک دل میں پیدا ہوتی ہے"

(حیات سعدی دیباچہ)

یہ امر صاف ہو گیا کہ مولانا کے نزدیک سوانح عمری کے ذریعہ کسی بھی انسان کے حالات اور نفسی کیفیات کا جاننا اہمیت نہ رکھتا تھا۔ اور محض ایک انسان کے حالات زندگی سے ان کو چنداں دلچسپی نہ تھی بلکہ جیسا کہ ان کے ماحول اور قومی حالات کا تقاضا تھا وہ ایسے لوگوں کی سوانح عمریوں کے ذریعہ اپنا مشن پورا کرنا چاہتے کہ جن کی سوانح عمریاں انگلستان کے مشہور مصنف کے قول کے مطابق جس کو کہ وہ خود نقل کرتے ہیں کہ

"بیوگرافی چلا چلا کر اور سمندر کے طوفان کی طرح غل مچا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کام کرو۔"

غل مچا کر دوسروں کو بھی کچھ کرنے پر آمادہ کر سکیں اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بے شمار اسلاف میں سے صرف تین ایسے اشخاص کی

سوانح عمری منتخب کی جنہوں نے بے وانعی اپنی اپنی جگہ غل مچایا اور اپنے زمانے میں وہ منفرد مجدد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سعدی کی حق گوئی ہمت اور مستعدی ایران کے اس دور تعطل میں ذوق عمل کا یہ جذبہ اور سیر و سیاحت ہر زمانے میں قابل تقلید رہی ہے اور رہے گی۔

اسی طرح غالب جن کی شاعری ایک طرح احتجاج کے مرادف ہے اور ان کے ذہن کے جارحانہ رجحان اور انقلاب پسندی کا ثبوت قرار دی جاسکتی ہے جس کو پہلی دفعہ تنگنائے غزل کی محدودیت اور تنگی کا احساس ہوا اور جو بے کنار وسعتوں اور بلندیوں کا متلاشی تھا۔ جس نے اردو مکتوب نویسی کو ایسی حسین اور طرحدار ادا بخشی کہ جس کے طفیل اردو خطوط نویسی کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ یہی اپنے زمانے کی منفرد شخصیت ہیں اور اردو شعرار کی ذہنیتوں کی تبدیلی میں بالواسطہ انقلاب کا سبب بنے۔

حیات جاوید کا نفس ہر لمحہ اور ہر واقعہ درحقیقت سمندر کی مضطرب اور طوفانی موجوں کی طرح نوی غفلت کی بے حس چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر غل مچا رہا ہے کہ جاؤ تم بھی ایسے کام کرو۔

اگرچہ مولانا حالی سے پیشتر اردو میں حقیقی سوانح نگاری کی طرف ایک قدم مولوی محمد حسین آزاد اٹھا چکے تھے۔ اور آب حیات میں عام تذکروں کی رسم اور روایات کے خلاف مختلف شعرار کی زندگی کے جیتے جاگتے

مرقعے تیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن آب حیات میں تاریخی اور سوانحی حقائق کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ صرف تخیل کی بلند پروازی اور الفاظ کی شعبدہ گری پر انحصار ہے اور در اصل اُردو سوانح نگاری کا آغاز مولانا حالی نے ۱۸۸۶ء میں حیات سعدی کی تصنیف سے کیا اور یہی اُردو زبان کی سوانح نگاری کا سنگ میل ہے اس سے قبل اردو میں کوئی سوانح نگاری اس نہج پر نہیں لکھی گئی اگرچہ اس سے پہلے تذکرہ ترجمہ اور فن رجال کے طور پہ کتابیں اسلامی ادب میں موجود نہیں تھیں لیکن حالی نے

"جو علمی انداز حیات سعدی کے لئے اختیار کیا ہے وہ بالکل جدید امتیاز ہے۔" (شیخ چاند رسالہ اردو)

حیات سعدی پر کچھ کہنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار پھر دیکھ لیا جائے۔ کہ کچھ تو وقت اور مذاق عامہ کے تقاضے سے اور کچھ اپنی مروت اور خوش صفاتی کی بنا پر یہ مولانا حالی نے جدید سوانح نگاری کی شرائط کو جانتے ہوئے بھی اپنی سوانح نگاری کی بنیاد کن اصولوں پر رکھی تھی۔ یہ خود ان کے ہی بیان سے واضح ہو سکتا ہے۔

"ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی کریٹکل طریقے سے بیوگرافی لکھی جائے۔ اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں۔ اور اس کے عالی خیالات

کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں چنانچہ اسی خیال سے ہم
نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے
اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں ان کی اور ان
کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے چھوڑوں
کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔"

(حیات جاوید دیباچہ)

اس کے علاوہ یادگار غالب اور حیات سعدی کے متعلق ان کا یہ کہنا بھی بڑی حد تک درست ہے کہ پہلی سوانح عمریاں ایسے لوگوں کی ہیں جن کی زندگی میں اتنے اتار چڑھاؤ پیچ و خم ہی ہی نہیں جن پہ نکتہ چینی کی جائے اور خود ان کے بقول۔

"اس کے سوا وہ انھیں لوگوں کے حال سے مناسبت
رکھتی ہے جنھوں نے اس موج خیز اور پر آشوب
دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ ڈالی ہی نہیں اور کنارے
کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا
اترے ان کو سب نے بھلا جانا کیونکہ ان کو کسی برائی یا بھلائی
سے کوئی سروکار نہ تھا۔"

(دیباچہ حیات جاوید)

حیات سعدی کے مطالعہ کے سلسلہ میں سب سے پہلے جس بات کا احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مولانا کو فارسی ادب نظم و نثر سے کس درجہ

شفقت اور لگاؤ تھا اور وہ اس کا کتنا زبردست علم رکھتے تھے۔ پھر ہمیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ایک کامیاب اور سچے سیرت نگار کی طرح مولانا نے اپنے موضوع کا بڑا صحیح انتخاب کیا ہے وہ اپنے موضوع سے محبت اور عقیدت ہی نہیں رکھتے بلکہ ان کے اور ان کے موضوع کی طبائع میں کچھ مناسبتیں اور مطابقتیں بھی موجود ہیں۔ دونوں حق بات کہنے میں باک نہیں رکھتے۔ دونوں کا اسلوب سادہ اور بے ساختہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دونوں اپنی اپنی زبان کے قادر الکلام شاعر اور زبردست نثار تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سعدی کے کلام اور سوانح پر تبصرہ کرنے کے لئے حالی بہت موزوں اور مناسب تھے۔

حیات سعدی شیخ کے مختصر حالات پر مشتمل ہے اور کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔

۱۔ نظم و نثر پر تبصرہ اور محاکمہ ۲۔ شیخ کے حالات

۳۔ خاتمہ جس میں ان کے عام حالات زندگی کی روشنی میں کلام کو پرکھا اور سراہا ہے۔

اس مشہور اور ہر دلعزیز شاعر کے حالات اتنے مختصر اور وہ بھی حالی کے قلم سے نکلے ہوئے دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے۔ لیکن اس اختصار اور تشنہ تحقیق کے لئے ہم ان کو الزام نہیں دے سکتے باوجود انتہائی تلاش اور تجسس کے ان کو ان تذکروں اور یادگاروں میں جو شیخ

کے سوانح کے بطور لکھے گئے تھے صرف اتنا ہی مواد مل سکا۔ جو انھوں نے بڑے سلیقے اور ترتیب سے پیش کر دیا ہے۔ مولانا کو اس مختصر سی سوانح حیات کے مرتب کرنے میں جس تلاش تحقیق اور پھر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ کچھ کم لائق ستائش نہیں۔ چنانچہ اس کے دیباچہ میں ذکر کرتے ہیں کہ انھوں نے فارسی تذکرے جس قدر ان کو مل سکے ان سے استنباط کیا اور سر گور اسلی صاحب کا انگریزی تذکرہ بھی دیکھا تمام تذکروں میں ایک ہی سی حکایتیں اور نقلیں مندرج پائی ہیں۔ شیخ کی تصنیفات پر بھی اجمالی تعریف کے علاوہ ان کے کلام کی عظمت کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ تاریخی حقائق اور واقعات کا پتہ لگانا بھی مشکل تھا چنانچہ "علی بن احمد" جامع کلیات شیخ کے دیباچے اور انگریزی کتابوں کے علاوہ خود ان کے کلام سے بڑی چھان بین کے بعد نتائج برآمد کیے۔ اور بقول مولوی عبدالحق صاحب۔

"صرف ان کے کلام کے مطالعہ سے شہد کی مکھی کی طرح ذرہ ذرہ چن کر سعدی کے سیرت اخلاق و اور حالات مرتب کیے۔"

(اردو جولائی ۵ء خطبہ صدارت بیاد حالی)

غرض اس دماغ سوزی اور جگر کاوی کے بعد انھوں نے حیات سعدی کا نذرانہ اردو سوانح نگاری کے حضور پیش کیا ہے

اور یہ اردو زبان کی پہلی کتاب ہے۔ جس میں کسی بھی شاعر کے اتنے مفصل حالات کے علاوہ اس کے کلام پر محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے تبصرے کے علاوہ اس میں موازنے اور مقابلہ کا بھی اصول رائج کیا ہے۔ گلستان کی خوبی کا اندازہ نو فارستان اور پریشان سے کیا ہے۔

حیات سعدی میں حالی کی سنجیدہ اور متوازن رائے بھی قابل توجہ ہے اگرچہ وہ شیخ سے بے حد متاثر ہیں اور وہ ان کا پسندیدہ ہیرو ہے۔ لیکن ان کا مخصوص دھیما اور متوازن انداز شیخ کی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوا ہے البتہ بعض وقت رواداری اور جانب داری سے کام لیا ہے اور ان پر متعدد اعتراضات کئے ہیں۔ مثلاً (۱) ایک جگہ مولانا حالی نے سعدی کے اس نظریئے کی تائید کی ہے کہ یہودی خواہ کتنا ہی دولت مند کیوں نہ ہو جائے۔ مگر اس کو شریف نہیں کہا جا سکتا۔

۲۔ سعدی کے یہاں محبوب مذکر ہے اور سادہ رویوں کی تعریف جا بجا کی ہے۔ اور مولانا حالی اس الزام کو دور کرنے کی غرض سے مختلف تاویلیں پیش کرتے ہیں جو الزام کو دور نہیں کر سکتی ہیں۔

۳۔ سعدی نے بغداد کی تباہی اور مستعصم کے قتل پر مرثیہ لکھا ہے اس بات پر اعتراض کیا گیا ہے کہ انھوں نے ایک نا اہل انسان کی تعریف کی ہے اور اس تباہی پر اظہار رنج کیا ہے اور مولانا حالی نے اس کی صفائی پیش کرنا چاہی ہے۔

تیسرا اعتراض مولانا پر کچھ بے جا معلوم ہوتا ہے۔ اگر انھوں نے اپنے ہیرو پر سے اس اعتراض کی صفائی کرنا چاہی ہے تو کچھ نامناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ان کا ہیرو ایک شاعر تھا۔ اور وہ خود بھی شاعر تھے۔ شاعر کا دل عجیب مختر خیال ہوتا ہے۔ اس کا دل بعض وقت بڑے سے بڑے واقعے کتنا ثر نہیں ہوتا اور بعض وقت ذرا سا اشارہ اس کو خون کے آنسو رلا دیتا ہے۔ اکثر اس کو دوست دشمن اچھے بڑے اپنے بیگانے میں فرق نہیں محسوس ہوتا وہ کسی کی بھی تکلیف پر چیخ اٹھتا ہے۔ پھر سعدی اگر معتصم کی تباہی پر چیخ اٹھے تو اس میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اور اسی جذبے کے ماتحت حالی نے اس کی صفائی پیش کرنا چاہی ہے۔

ایک بات مولانا حالی کی البتہ بڑی طرح کھٹکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے شیخ کے مذہب کا ذکر چھیڑ کر اس کی تاریکی اور لاعلمی پر رہنے دیا ہے۔ اور باوجود معتبر ذرائع سے شیخ کے مذہب کا علم رکھنے کے باوجود یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

"ہم اس کو کسی خاص مذہب کا ثبوت ایک ایسے شخص کو جو مقبول فریقین ہے۔ ایک گروہ کا مقبول اور دوسرے گروہ کا مردود نہیں بنانا چاہیے۔"

در اصل اگر ان کا منشا یہی تھا تو ان کو اتنا لکھنا بھی لازم نہ تھا انھوں نے یہ کہہ کر ان کے متعلق تجسس رکھنے والوں کو خلش

میں مبتلا کر دیا۔

اس کے علاوہ مولانا حالی سے ایک شکایت یہ بھی کی جاتی ہے کہ انھوں نے سعدی کو ایک شاعر اور معلم اخلاق کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اس کی انسانی اور شخصی حیثیت کو بھول گئے۔ اس سلسلہ میں واقعات اور مواد کی کمی بلکہ نہ ہونے کی وجہ سے حالی پر یہ الزام سختی سے عاید نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تاہم نقادان فن حیات سعدی کو فنی معیاروں پر جانچتے وقت اعتراض کر سکتے ہیں۔ اور ان کو حق بجانب سمجھا جائے گا۔ آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ حیات سعدی ہماری اردو سوانح نگاری کا اولین اور بیش قیمت سرمایہ ہے۔

۱۔ یادگار غالب۔ یہ مولانا حالی کی دوسری سوانحی تصنیف ہے جس کو اکرام صاحب نے شبلی نامہ کے دیباچے میں مولانا حالی کے فنی شاہکار کے نام سے یاد کیا ہے اور جس کے بارے میں عبدالحق صاحب کا خیال ہے کہ۔

"نثر حالی میں تین کتابوں یعنی "یادگار غالب"، "مقدمہ شعر و شاعری" اور "حیات جاوید" کو درجہ کمال حاصل ہو چکا ہے یعنی یہ وہ کتابیں ہیں۔ جو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ہمیشہ ذوق و شوق سے پڑھی جائیں گی۔"

(خطبہ صدارت یاد حالی اردو جولائی ۵۹ء صفحہ ۲۲۶)

یادگار غالب

۲۔ یادگار غالب حالی کا فنی شاہکار اس لئے ہے کہ اس میں مقصدیت اور تنقیدی عنصر تقریباً مفقود ہے۔ اگرچہ یادگار اور حیات جاوید میں کئی امور یکساں ہیں یعنی حیات جاوید کی طرح یادگار کا ہیرو بھی مصنف کا ہمعصر ہے اور اس ہیرو سے بھی مصنف کو دلی عقیدت اور محبت ہے لیکن وہ والہانہ ارادتمندی اور شیفتگی نہیں ہے جو سرسید سے تھی۔ وہ یادگار کے ہیرو کو ایک بلند پایۂ شاعر اور ایک نئی طرز فکر کی طرح ڈالنے والے ہی کی طرح پیش کر سکتے تھے۔ اور بس اور اس کا احساس مصنف کو شدت کے ساتھ ہے اور اپنے دیباچے میں انھوں نے جا بجا اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ

"اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام ان کی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا۔ مگر صرف اسی کام نے ان کی لائف کو دارالخلافہ کے آخر دور کا مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا۔"

(یادگار غالب دیباچہ صفحہ نمبر ۳)

لیکن انسانی زندگی میں افادی پہلو ڈھونڈنے والے اور اپنے موضوع سے دردمندانہ الفت رکھنے والے اس فطری سوانح نگار نے اپنے موضوع کے انتخاب کا جواز ڈھونڈ ہی لیا ہے اور لکھتے ہیں۔

"اگرچہ مرزا کی لائف جیسا کہ ہم آئندہ کسی موقع پر بیان کریں گے ان فائدہ سے خالی نہیں ہے جو ایک بیاگرافی سے حاصل ہونے چاہئے۔ لیکن ان فائدوں سے قطع نظر کی جائے تو بھی ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی کے لئے شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو۔ ہماری پژمردہ دل سوسائٹی کے لئے کچھ کم ضروری نہیں۔"

(دیباچہ صفحہ ۸)

حالی کے یہی چھوٹے چھوٹے نکتے ان کا مقام بحیثیت سوانح نگار کے بلند تر کر دیتے ہیں۔ ایک ایسے شخص کا جس کی فطرت میں شگفتگی اور زندہ دلی کا فقدان ہو۔ اپنے موضوع کی اس صفت کو جو خود اس کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی سراہنا اور اس کی اہمیت کو سمجھنا ہی اس کی فنی پختہ کاری اور بالغ نظری کی دلیل ہے۔

اگرچہ مولانا حالی اپنی یادگار کے ہیرو کی بے تکلف صحبتیں عرصہ تک اٹھا چکے تھے۔ اور انھوں نے ان کو بڑے قریب سے دیکھا تھا۔ لیکن پھر بھی اس تصنیف میں انہوں نے ذاتی معلومات پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اسی سائنٹفک طریق کار سے کام لیا جس سے ایک سوانح نگار کو لینا چاہیئے چنانچہ ایک جگہ اس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میں نے مرزا کی تصنیفات کو دوستوں سے مستعار لے

کہ جمع کیا اور جس قدر اس میں ان کے حالات اور اخلاق
وعادات کا سراغ ملا قلم بند کیا جو باتیں اپنے ذہن میں
محفوظ تھیں یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں ان کو بھی
ضبط تحریر میں لایا ۔ (دیباچہ یادگار غالب)

غرض مولانا نے اس مواد اور ان ذرائع کو جو مل سکتے تھے
بڑے سلیقے سے استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کو غالب کے
خطوط اور مختلف بیانات سے بھی ان کی شخصیت پر روشنی ڈالنے
کا موقع مل گیا حقیقت یہ ہے کہ یادگار کی تصنیف میں حیات سعدی
سے زیادہ دقتوں اور پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ کیوں
کہ یادگار کا ہیرو مصنف کا معاصر ہے اور کسی معاصر کے سوانح نگار
کو متعدد دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کام کے لئے خاص
لیاقت درکار ہوتی ہے۔ کیونکہ ہیرو کے مخالفین اور واقفین دونوں
موجود ہوتے ہیں ان سب کو ہم خیال بنانا مشکل ہوتا ہے۔

ان کے حالات منتشر اور بے قاعدہ ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان
کو گزرے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوتا اس لئے ایسے واقعات بکثرت
ہوتے ہیں جن کو جمع کرنا ایک خاص سلیقے کا محتاج ہوتا ہے۔ لیکن حالی
نے بڑی سنجیدگی اور شائستگی سے کام لیا ہے۔ واقعات کی کثرت اور
ہجوم سے گھبرائے نہیں ہیں بلکہ
نہایت استقلال اور خاطر جمعی سے ان گوناگوں اور

مختلف و متضاد نوعیتوں کے حالات و واقعات کو قابو میں لاکر قلم بند کئے ہیں۔"

(رسالہ اردو شیخ چاند)

مولانا مرزا کی نجی زندگی میں خاصے دخیل تھے۔ یہاں تک کہ یادگار میں انھوں نے مرزا کو نماز کے لئے تلقین کرنے اور پھر اس سلسلے میں شکر رنجی ہو جانے کا جو واقعہ لکھا ہے۔ یہ ان کے قریبی تعلقات اور آپس کی محبت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مرزا غالب ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اور جبکہ دوسروں کو شعر گوئی سے باز رکھنے کی تلقین کرتے تھے۔ اس وقت حالی کو شعر گوئی کی طرف توجہ دلاتے تھے۔ لیکن حالی نے مرزا کے حالات جمع کرنے میں بڑی احتیاط اور اختصار سے کام لیا ہے۔ یہ احتیاط بعض وقت ایک عیب نظر آتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے یگانگت سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا۔ حتیٰ کہ ان ملفوظات کو بھی جمع نہ کیا جن کے متعلق خود انھوں نے یہ لکھا ہے کہ

"اگر کوئی شخص غالب کے تمام ملفوظات کو جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف و ظرافت کی تیار ہو جاتی۔"

تاہم یہ ایک مستند کتاب ہے اور اس کتاب سے ہی دوسرے تمام غالب کے تذکرہ نگاروں نے مدد لی ہے اور آج تک اس سے بہتر تذکرہ مرتب نہیں کیا جا سکا۔ اور اس طرح یہ کہنا بے جا نہیں معلوم ہوتا کہ غالب کی شخصیت اور عظمت سے آج کسی کو

انکار نہیں لیکن اس کا احساس دلانے والے مولانا حالی ہی ہیں اور بقول ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب۔

"اسے مرزا کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے کہ انھیں حالی جیسا شاگرد نصیب ہوا جس کے قلم نے ان کی شاعری اور زندہ دلی کا پیغام جدید ہندوستان کے کانوں تک پہنچایا۔"

ایک دوسری خاص بات اس تذکرے کی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں نفسیاتی تجزیئے کا فقدان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نقادان فن نے اس کو مرزا غالب کا جامع تذکرہ تسلیم نہیں کیا ہے۔ کیونکہ سوانح نگار کا فرض ہے کہ اپنے ہیرو کی زندگی کے مسائل اور عقدہائے لاینحل کو اس کی شخصیت اور ذات کو نفسیاتی مطالعہ اور تجزیہ کے ذریعہ واضح کر کے ہر پیچیدگی اور الجھن کو دور کر دے اور مولانا حالی نے اس فرض سے پہلو تہی کی ہے

اس کے علاوہ ایک اور کمی ہے جو ایک عام قاری کو یادگار غالب میں محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کی عبارت میں ایک قسم کی بیگانگی سی جھلکتی ہے اور عبارت کے انداز سے کسی طرح یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مصنف کسی ایسے شخص کا ذکر کر رہا ہے جس سے اس کو بے انتہا انسیت اور محبت ہے۔ اگرچہ سوانح نگاری میں ایک حد تک مصنف کا اپنے جذبے کو شامل نہ کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ لیکن نہ اتنا کہ عبارت

بجز میکانکی ہو کر رہ جائے غالب جیسے زندہ دل اور خوش بیان شاعر کے تذکرے میں اتنی بے کیف عبارت کچھ بھلی نہیں معلوم ہوتی ۔ یادگار سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے غالب کے حالات کافی تحقیق سے آب حیات میں پیش کئے ہیں۔ لیکن انھوں نے غالب کی حقیقی عظمت کو یا تو جانا ہی نہ تھا یا اس کو نظر انداز کر دیا۔ مولانا آزاد اپنے استاد ذوق کو فوقیت دینے کی دھن میں غالب کو ان کی سطح سے بہت نیچے لے آئے ہیں۔ اور اس طرح وہ غالب کے اس پہلے تذکرے میں ان کی سچی اور غیر جانب دارانہ تصویر کشی کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ لیکن حالی نے سعادت مندانہ اور شاگردانہ جذبہ کے ماتحت لکھا ہے جس کے ماتحت آزاد نے اپنے استاد کو غالب پر فوقیت دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن حالی کا جذبہ زیادہ راسخ اور بے ضرر تھا انھوں نے اپنے استاد کی عظمت کو معلم نو کروا دیا لیکن اس سے کسی دوسرے کے رتبہ اور مقام کو ٹھیس کبھی نہیں لگنے دی۔ ان کی دوسری تصانیف کی طرح یادگار میں بھی غضب کا توازن اور اصابت رائے پائی جاتی ہے اور جب یادگار غالب کا مقابلہ ڈاکٹر بجنوری مرحوم کی محاسن کلام غالب اور ڈاکٹر لطیف صاحب کی کتاب سے کیا جاتا ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یادگار جنت اور دوزخ کے درمیان ایک برزخ ہے۔ جس میں بڑے اعتدال متانت اور احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ ایک طرف تو محاسن کلام

غالب کے مصنف بجنوری۔ غالب کو ولی فلاسفر اور سائنس داں ثابت کرتے ہیں۔ اور ان کے کلام کو وید مقدس کا ہم پلہ بتاتے ہیں دوسری طرف لطیف صاحب غالب کو ایک عام انسان اور شعریت سے معرا ٹھہراتے ہیں۔ لیکن یادگار کا مصنف سنجیدہ اور متوازن مزاج اور فطرت کا مالک تھا وہ خود ایک مستند شاعر تھا۔ جس نے اردو۔ شاعری میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ وہ قدر جوہر خوب جانتا تھا۔ مولانا کی یادگار اتنی جامع اور مکمل ہے کہ اس کے بعد کسی دوسرے تذکرے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شبلی نے سچ ہی کہا تھا کہ!۔

"مزار غالب کے حالات اور ریویو مولوی صاحب نے جس تفصیل سے لکھے ہیں اس کے بعد کسی اور کتاب کی کیا ضرورت ہے۔"

حیات جاوید: یہ مولانا حالی کی اہم ترین تصنیف ہے یہ کتاب ہر لحاظ سے بے حد اہم ہے۔ اور بقول مولوی عبدالحق صاحب

"تیسری کتاب حیات جاوید حالی کی سب سے بڑی اور اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں صرف سید احمد خاں کی اس سیرت اس کے حالات اور کارناموں ہی کا بیان نہیں بلکہ ایک اعتبار سے مسلمانوں کے ایک صدی کے تمدن کی تاریخ ہے۔"

یادِ حالی۔ خطبۂ صدارت ار دو جولائی ۱۹۵۸ء)

بحیثیت سوانح عمری کے یہ کتاب اور بھی اہمیت رکھتی ہے اور اس کے مطالعہ سے ہی ہم حالی کے فن سوانح نگاری کے بارے میں کوئی قطعی رائے دے سکتے ہیں۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ مصنف کے لئے مشکل ترین امتحان اور آزمائش ہے۔ اس کا ہیرو اپنے مصنف کی نظر میں جس قدر اہم اور محبوب تھا اتنا ہی اس کو گرفت میں لانا مشکل تھا۔

ایک ایسے شخص کی سوانح عمری لکھنا جس کی زندگی کا ہر لحظہ کچھ نہ کچھ کرنے گزرا جو مجسم عمل اور سراپا خلوص تھا۔ جس کی تمام زندگی ایسی تگ ودو میں گزری کہ اس کا حال اس سراسیمہ مسافر کا سا ہو کر رہ گیا تھا جس کو چند منٹ کے اندر لا تعداد اور وزنی اسباب لے کر گاڑی میں سوار ہونا ہو اور جس کی عجلت اور سراسیمگی کے متعلق خود مصنف کو یہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ۔

"سرسید کی حالت اس بے قرار آدمی کی طرح تھی جو گھر میں آگ لگی دیکھ کر بے تابانہ ہمسایوں کو آگ بجھانے کے لئے پکارتا ہے۔"

ایسی مصروف اور بے قرار زندگی میں جد وجہد مظاہرہ قوت جھلاہٹ اور لغزشوں کا ہونا ضروری ہے۔ اور یقینی امر تھا اور ساتھ ہی ساتھ جس کی زندگی کے ہر لمحہ سے مصنف کو جذباتی۔

وابستگی ہو اور وابستگی بھی کسی کہ وہ اپنے موضوع کی آنکھوں سے دیکھتا اسی کے کانوں سے سنتا اور اسی کی زبان سے بولتا ہے۔ بہت ہی مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ ایسی سوانح عمری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بڑی فنکاری سنجیدگی اور صلاحیت درکار ہے۔ اور درحقیقت مولانا حالی اس فرض سے باوجود چند کوتاہیوں کے اس خوبی اور ہنرمندی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں کہ جدید زمانے کے حقیقت پرست نقاد جو کہ کسی طرح کی بھی رعایت اور جانب داری کو حرام قرار دیتے ہیں۔ حیات جاوید کی اہمیت اور فضیلت سے انکار نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ مولوی عبدالحق اس کے متعلق یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ۔

"ہماری زبان میں یہ اعلیٰ اور مکمل نمونہ سوانح نگاری کا ہے۔" (یاد حالی خطبۂ صدارت اردو ۵۴ء)

ایسی سوانح عمری لکھتے وقت اور بھی دقت پیش آتی ہے جبکہ مصنف کی اپنی فطرت حد درجہ عیب پوش اور درگذر کرنے والی ہو۔ غرض کہ مولانا حالی کی راہ میں یہ تمام رکاوٹیں حائل تھیں اور بقول شیخ چاند۔

"بے چارے خوش صفات خاموش مزاج سنجیدہ دماغ حالی کے حصہ میں وہ ایسی سوانح عمریاں آئیں جن کے اشخاص ان کے معاصرین تھے۔ اور اپنی سطح سے بلند۔" (رسالہ اردو ۵۴ء)

لیکن انھوں نے تمام کشمکش اور مشکلات کے باوجود اس۔
خیال سے کہ سچ اور صرف سچ ہی میں یہ کرامت ہے۔ کہ جس قدر اس
کی زیادہ کرید کی جاتی ہے اسی قدر اس کے جوہر زیادہ آب و
تاب سے ظاہر ہوتے ہیں۔ (حیات جاوید)

فیصلہ کر لیا کہ سرسید کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کریں
گے۔ اور جہاں موقع ہوگا۔ نکتہ چینی سے کام لینے میں بھی گریز نہیں
کریں گے۔ اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ مذاق عامہ ابھی اپنے ناموروں
اور اشخاص سوانح کے متعلق نکتہ چینی کے لئے آمادہ نہیں ہوا۔ نکتہ
چینی کی بناء ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"اس شخص کی زندگی پر لکھنا جس نے چالیس برس
جہالت اور تعصب کا سامنا کیا ہے۔ قوم کے بچے پھوڑوں
کو چھیڑنا ہے کڑوی دوائیں پلائی ہیں۔"

اس کے علاوہ انھوں نے اپنی نکتہ چینی کے جواز میں یہ دلیل
بھی پیش کی ہے کہ۔

"وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ
چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ سب
سے پہلے اسی کی زندگی میں اس کی پیروی کی جائے اور
نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔"

اس نہج کی سوانح عمری کی تصنیف کے لئے مولانا نے ان تمام

ذرائع سے بڑے سلیقہ اور احتیاط سے کام لیا جو سوانح نگاری کے سلسلہ میں کام آسکتے تھے اور جن کی مدد سے ایک بلند پایہ سوانح عمری تیار کی جا سکتی ہے انھوں نے ۱۸۹۶ء میں اسی غرض سے علی گڑھ میں قیام کیا اور اس وسیع ذخیرۂ معلومات سے فائدہ اٹھایا جو وہاں موجود تھا۔ اس سلسلہ میں منشی سراج الدین صاحب کا مسودہ بھی حاصل کر لیا۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سر سید کی جملہ تصانیف خطوط دوستوں کے بیانات انگریزی اخباروں موافق رسالوں اور مدبران سلطنت کی تحریروں کا ایک ایک حرف پڑھا اور اس کے مفید مطالب سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔

کتاب کے دو حصے ہیں: تاریخی ترتیب کے لحاظ سے زندگی کے حالات اور کارناموں کا بیان اور دوسرے میں کارناموں پر تبصرہ اور مجموعی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا ہے۔

مولانا حالی نے سر سید کی خارجی اور بیرونی زندگی کے تمام پہلوؤں اور واقعات کو بیان کیا ہے۔ اور اپنی اس جامع تصنیف میں مصنف اپنے ہیرو کی زندگی کے ہر ہر قدم پر اس کے ساتھ ساتھ نظر آتا ہے۔ اس نے اپنے ہیرو کی زندگی کے ہر ہر لمحہ کو اتنا ہی عزیز اور گراں قدر جانتا ہے جتنا وہ خود ہیرو کی نظر میں ہو گا۔

مولانا حالی نے سید صاحب کے خاندانی حالات سے لے کر ان کی رحلت تک کے واقعات کو بڑی ترتیب اور خوبی سے پیش کیا ہے

سید صاحب کے بچپن کے حالات خاندانی طور وطریق اور عام شرفائے دہلی کے رسم ورواج بڑی سلاست اور پاکیزگی سے بیان کئے ہیں ۔غرض حیات جاوید میں ہم سید صاحب کی زندگی کے ہر دور کے متعلق دلچسپ اور پراز معلومات جزئیات اس طرح ملتی جلتی ہیں کہ ان کی شخصیت کی تدریجی ترقی اور رفتار خود بخود سامنے آتی چلی جاتی ہے ۔

کتاب کے دوسرے حصہ پر اکثر اعتراضات کئے گئے ہیں اور یہ کہا گیا ہے کہ باوجود اس دعوے کے کہ حیات جاوید کی بنا نکتہ چینی پر رکھی گئی ہے اور جہاں کہیں ممکن ہوگا اس سے گریز نہیں کیا جائے گا۔ مولانا حالی اس سلسلہ میں ناکام ہی نہیں رہے بلکہ انھوں نے اس سے دیدہ ودانستہ گریز کیا ہے ۔اور جہاں کہیں ان کی کوئی کمزوری یا قابل اعتراض بات بیان کی ہے فوراً اس کے جواز کے لئے کوئی دلیل بھی لے آئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اعلیٰ سوانح نگاری کے منافی ہے۔ سوانح نگاری میں موضوع سے ہمدردی کے یہ معنی نہیں کہ موضوع کی ہر کمزوری کو اس کی بڑائی ثابت کریں اور ان کے متعلق تاویلات پیش کی جائیں ۔معترضین میں سب سے پہلا نام مولانا شبلی کا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

> حیات جاوید میں مولانا حالی نے "سید صاحب" کی ایک رخی تصویر دکھائی ہے ۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانے تنگ خیالی اور بد طینتی سے ہے

لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب
برباد ہو جائیں۔" (افادات مہدی صفحہ ۳۱۴)

اسی طرح مولانا شبلی حیات جاوید پر مدلل مداحی کا بھی اعتراض وارد
کرتے ہیں۔

دراصل مولانا حالی کا یہ فعل اتنا سخت اور سنگین نہیں ہے جتنا سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے ضمناً ان کی کمزوریوں اور لغزشوں کا ذکر کر ہی دیا ہے۔ جو سید صاحب سے خصوصاً آخری عمر میں سرزد ہوئیں۔ مثلاً بعض معاملات میں ان کی ضد اور جارحانہ کارروائیاں اور دھمکیاں وغیرہ وغیرہ البتہ ایک بے اعتدالی یا لغزش جو مولانا سے ہوئی یہ ہے کہ انھوں نے معاملات کو سرسید کے ذہن و فکر کی روشنی میں دیکھ کر ان کے اقدامات کے جواز کی دلیلیں بھی پیش کر دی ہیں۔ یہ چیز کسی سوانح عمری کی فنی خامی میں شمار کی جاتی ہے۔ لیکن کسی سوانح نگار سے یہ توقع بھی عبث ہے کہ وہ اپنے موضوع کے نامۂ اعمال میں باقاعدہ ایک باب اس فرد جرم کا بھی شامل کرے گا بلکہ ایک ہمدرد اور ایک کامیاب سوانح نگار سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہمدردی کے ساتھ اس کی کمزوریوں کا تجزیہ کرے اور اس امر پر روشنی ڈالے کہ اس لئے وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا

سوانح نگاری کے جدید تصور کی بنا پر حیات جاوید پر ایک اعتراض اور بھی کیا ہے۔ وہ یہ کہ اس میں صاحب سوانح کی شخصیت کے باطن ان کے ذہنی ارتقاء اور ان کے محرکات اعمال سے بحث نہیں کی گئی۔ حاصل یہ ایک بڑی کمی ہے جو حیات جاوید جیسی اعلیٰ اور جامع تصنیف میں کھٹکتی

ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں اس عنصر کی تلاش عبث ہے کیونکہ حالی کے زمانے تک سوچنے کا یہ انداز اچھی طرح ابھرا نہ تھا۔ بلکہ شاید اس وقت تک ظہور میں بھی نہ آیا تھا۔ ان کے زمانے تک سوانح عمری کسی شخص کی زندگی کے ظاہری نقوش سے عبارت تھی۔ باوجود اس عنصر کی ظاہری کمی کے حالی کے پیش کردہ مرقعے ہیں ہم اس سیماب مجسم کو زندہ اور متحرک دیکھتے ہیں۔ اور اس کی تمام ذہنی اور فکری کشمکش ہم پر واضح ہو جاتی ہے۔ جس نے مدت العمر اس کو ایک بے چین اور مضطرب موج کی طرح پریشان رکھا۔ حیات جاوید کے اعلی اور مکمل۔ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آج بھی ہمارے جدید سوانح نگاروں کو سرسید کے بارے میں لکھتے وقت حیات جاوید کے قدرے کمزور لیکن مستند سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

حالی کی تینوں سوانحی تصانیف کے جائزے اور محاکمہ کے بعد بھی ان کے فن سوانح نگاری کے بارے میں مجموعی طور پر کچھ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کیونکہ ان میں چند نمایاں خامیاں بھی موجود ہیں۔ اور سوانح کے زبردست فنکارانہ محاسن بھی ہیں۔ جیسا کہ گذشتہ اوراق میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ حالی نے ایک کامیاب اور سچے فنکار کی طرح اپنی تصنیفات سے موضوعات کا بڑا موزوں اور مناسب انتخاب کیا ہے۔ اور اپنی سوانح نگاری کے لئے وہی ہیرو منتخب کئے ہیں۔ جن سے خود ان کو طبعی مناسبت اور لگاؤ تھا۔ حیات سعدی کے جائزے کے سلسلے میں یہ بھی ذکر کیا جا چکا ہے

کہ سعدی اور حالی میں کئی طبعی مناسبتیں تھیں۔ ہر دو اپنے وقت کے بڑے شاعر اور زبردست نثار تھے اسی طرح دونوں کا اسلوب بھی مماثلت رکھتا ہے۔ اسی طرح یادگار غالب کے سلسلہ میں بیان کیا گیا ہے کہ مولانا کو اپنے اس ہیرو سے کس درجہ قرب و یگانگت حاصل تھی۔ اور استادی اور شاگردی کا دلچسپ اور مضبوط رشتہ اور بھی زیادہ اس حسن انتخاب کا باعث بن گیا۔ پھر ہم کو حالی کے فنکارانہ کمال کا اس وقت اور بھی زیادہ احساس ہوتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ حالی باہمہ سنجیدگی اور متانت ذاتی غالب کی شگفتگی اور بذلہ سنجی کے دل سے قدردان تھے اور اس کو اپنی مقصدیت کے لئے ایک افادی چیز سمجھ کر انھوں نے پیش کیا۔ اور حیات جاوید کے ہیرو کے تو رنگ میں وہ خود ہی رنگے ہوئے تھے۔

حالی کی تصانیف میں شخصیت کی ہو بہو تصویر یا یادگاری عناصر کے غلبہ کی تلاش بے سود ہے۔ ان کا مقصد کسی شخصیت کی تصویر کشی یا یادگار قائم کرنا ہونا ہی نہ تھا۔ وہ تو ان عناصر کو اپنی مقصدیت میں دلکشی اور جاذبیت پیدا کرنے کے لئے ضمناً استعمال کرتے تھے۔ اور یہ ان کا فنی کمال ہے کہ اس ضمنی بیان میں وہ خاصے زندہ اور مناسب مرقعے پیش کر گئے ہیں۔ لیکن دراصل ان کا مقصد اصلی سوانح نگاری کے ذریعہ سے قومی بیداری ترقی اور اصلاح تھا اس زمانے میں قوم اور ترقی دو ہی لفظ اہم اور قابل اعتنا تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسدس کا مصنف جب اپنے خیالات کو شعر کا جامہ پہناتا ہے تو اس سے اردو شاعری کی تزئین اس درجہ مقصد وہ نہیں ہے جس قدر اس لباس میں مقصدیت کو

حسین اور دلکش بنا کر پیش کرنا تھا۔ پیش نظر باب کے اولین اوراق میں مولانا حالی کے تصور سوانح نگاری کو واضح کرنے کے لئے حیات سعدی یادگار غالب اور حیات جاوید کے حوالوں کے اقتباسات سے اس امر کی وضاحت ہو چکی ہے کہ ان کا مقصد اس سے قومی بیداری ہے اور ایسے لوگوں کی سوانح حیات پیش کرنا ہے۔ جو دوسروں میں بھی ذوق عمل بیدار کر سکیں۔ ان تمام اقتباسات سے جو نتائج برآمد ہوئے تھے یہاں ان کا دہرا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مولانا حالی کے نزدیک سوانح عمری مندرجہ ذیل فوائد کی حامل ہے۔

۱۔ بے گرانی تازیانۂ عبرت ہے۔

۲۔ اس سے سوئی ہوئی پسماندہ قوموں کی رگ حمیت بیدار ہوتی ہے

۳۔ نیکی کی تحریک ہوتی ہے۔

۴۔ اچھائی برائی میں تمیز ہوتی ہے۔

۵۔ اس کا مطالعہ بڑے بڑے کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

مولانا حالی سوانح عمری کے ذریعہ قوم کے اندر ایک غل مچانا چاہتے تھے کہ جاؤ تم ایسے ہی کام کرو۔ چنانچہ انھوں نے غل مچایا۔

یہی وجہ ہے کہ حالی نے تھوڑے بہت شخصیت کے جو نقشے پیش کئے ہیں وہ فنی اعتبار سے ناقص ہیں۔ ہم ان کے ہیرو کی اسی شخصیت سے لطف اندوز ہو سکے ہیں۔ جو جلوت میں اور منظر عام پر نظر آتی ہے حالی شخصیت کے اس پہلو کو بڑی فراخدلی سے پیش کرتے ہیں۔ دوسروں کو

اس کے نزدیک لاتے ہیں اور اس کے فائدہ اٹھانے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ لیکن خلوت کی زندگی میں وہ ہمیں بار بار یہ اذن نہیں دیتے اور ایک چوکس اور فرض شناس دربان کی طرح پس پردہ کم ہے کم جھانکنے کا موقع دیتے ہیں۔ حالی شرافت اور خطا پوشی کے محاسن کو تو بڑے شدومد سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن بشری کمزوریوں کا تذکرہ کرنے نہیں دیتے اور ان کا قلم بار بار رک جاتا ہے۔ اور وہ عذر گناہ کے طور پر وقت اور مذاق عامہ کے تقاضے کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

"ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بایوگرافی کریٹیکل طریقے سے لکھی جائے اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اس کے اعلیٰ خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔" (حیات جاوید دیباچہ)

حالی کی سوانح عمریوں میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ ان میں تنقیدی پہلو پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یادگار غالب کو ایک ناقص سوانح عمری ٹھہرایا گیا ہے کیونکہ اس میں مصنف نے یہ کہنے کے باوجود کہ اس کے موضوع میں اگرچہ کوئی خاص بات اور اس کی زندگی میں کوئی قابل ذکر کارنامہ نہیں ہے۔ پھر بھی اس کی زندہ دلی خوش طبعی کو خاطر خواہ طریقے پر پیش نہیں کیا۔ اور مولانا حالی، غالب کی زندگی کی بعض اہم اور دلچسپ جزئیات نظر انداز کر گئے ہیں۔

یہی بات حیات سعدی میں ہے اور حیات جاوید کے اس تنقیدی

حصہ کی طوالت بنے تو اس کے سوانح نگارانہ فن پر زبردست اثر ڈالا ہے ورنہ یہ اعلیٰ بیوگرافی سے بہت قریب ہے۔

جزئیات کے انتخاب اور صداقت کی تلاش میں حالی کسی سوانح نگار سے پیچھے نہیں۔ اور حیات سعدی کی تصنیف میں تاریخی مواد کی فراہمی کے سلسلے میں ان کو تحقیق کی جن دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا اور مایوسی اٹھانا پڑی اس کا ذکر حیات سعدی کے ضمن میں کیا جاچکا ہے۔

درحقیقت مولانا عبدالحق نے یہ کہا ہے کہ انھوں نے سعدی کے کلام سے ذرہ ذرہ رس چوس کر شہد کی مکھی کی طرح یہ مواد فراہم کیا۔ اسی طرح انھوں نے اپنے معاصرین غالب اور سرسید کی سوانح عمریوں میں تحقیق و تلاش سے کام لیا اور باوجود ان لوگوں سے قرب و یگانگت کے تاریخی واقعات اور حالات کو بڑی تحقیق اور محنت سے جمع کیا۔ اور ان کے دیباچوں میں اپنی اس تلاش اور تحقیق کا ذکر بھی کیا ہے۔

ان کا اسلوب بیان اس درجہ رواں اور موضوع سے دلچسپی پیدا کرنے والا ہے کہ پڑھنے والا یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ حالی طبعاً سوانح نگار تھے انکے جذبۂ مہر و محبت کا ہر ہر قدم پر احساس ہوتا ہے وہ اپنی تشبیہوں اور تمثیلوں سے اسلوب کو مانوس اور دلنشین بناتے ہیں انکے اشخاص سوانح نگاری علمی لوگ ہیں اور سادہ انکا انداز بیان انکے شایان شان ہے اور وہ شان و شوکت نہیں ہے جو شبلی کے بیان میں نظر آتی ہے حالی کے تمثیلوں کا انکی عام انشاء اور سوانح عمریوں کی مقبولیت میں بڑا حصہ ہے اپنی کوتاہیوں کے باوجود حالی اردو کے بہترین سوانح نگار ہیں۔

چوتھا باب

شبلی اور ان کا فن سوانح نگاری

نیک خصال اور سلیم الطبع حالی کی سوانح عمریوں نے اردو میں سوانح نگاری کا باب کھول دیا۔ اور مولانا حالی کے معاصرین میں ایک کثیر تعداد نے اس صنف ادب پر قلم اٹھایا اور بکثرت سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ ان تمام لکھنے والوں کا نقطۂ نظر سوانح نگاری کے متعلق افادی اور مقصدی تھا۔ اور دوسری اصناف ادب کی طرح سوانح نگاری کو بھی قومی تعمیر اور مناظرانہ مقاصد کے لئے کام میں لایا گیا۔ خصوصاً آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگار خاص طور پر آپؐ کی سیرت کو مناظرانہ مقاصد کے لئے کام میں لائے اور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی سوانح عمریاں اس انداز میں لکھی گئیں کہ ایک طرف تو آن حضرتؐ کی عظمت اور خاتم النبیین اور اشرف الانبیاء ہونے کے دلائل اور صداقت کا اس۔

اس طرح ثبوت دیا گیا کہ غیر مسلموں کے اعتراضات اور حملوں کے جوابات بھی ہو جائیں۔

اس مناظرانہ سیرت نگاری کے علاوہ دوسرے موضوعات کو بھی سوانح عمریوں کے لئے منتخب کیا گیا۔ ان انتخابات میں مصنفین کے مزاج ماحول علمیت عادات اور مشاغل کو زبردست دخل تھا۔ غرض ہر مصنف نے اپنے موضوعات کا انتخاب اپنے فطری تقاضوں اور مناسبت طبع کے مطابق کیا۔

اُردو سوانح نگاری کے آسمان پر ان چھوٹے چھوٹے تاروں کے جھرمٹ میں ہمیں ایک روشن اور درخشاں قطب تارا بھی نظر آتا ہے جس کی نور بیز کرنیں آنکھوں میں چکا چوندسی پیدا کر دیتی ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی کی روشن اور پر جلال شخصیت اس دور کی سوانح نگاری پر کچھ اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ ان کے معاصرین کی نوشتہ سوانح عمریوں کی حیثیت ضمنی اور ثانوی ہو کر رہ گئی ہے۔ شبلی کی بوقلموں طبیعت کی نیرنگیوں سے ہماری دنیائے ادب میں کون واقف نہیں۔ وہ ایک ایسا سمندر ہے جس کی وسعتیں بے کنار ہیں۔ جس میں طوفان بھی پوشیدہ ہیں۔ جس کی پرسکون لہروں پر سینے ہوئے جہاز صحیح و سالم کنارے بھی جا لگتے ہیں۔ جس میں چاند کی گھٹتی بڑھتی کرنیں مدوجزر بھی پیدا کرتی ہیں۔ اور جس کو تنگناؤں سے گزرنا بھی اتنا ہی مرغوب ہے۔ جتنا چٹانوں سے ٹکرانا۔

شبلی کی زندگی میں اتنے اتار چڑھاؤ اور اتنے پیچ وخم ہیں کہ بعض

وقت ان کو سمجھنا بھی محال ہو جاتا ہے وہ اپنے زندگی بھر متضاد ماحول خیالات اور کیفیتوں سے دوچار ہوتے رہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی باتوں میں غضب کا تضاد ملے گا۔ وہ اپنے زمانے کا تجزیہ صحیح طور پر نہ کر سکے اور اسی وجہ سے

"شبلی علی گڑھ میں ایک عمر گزارنے کے بعد بھی علی گڑھ کے نقطۂ نظر کو سمجھنے سے قاصر رہے۔"

(شبلی از خورشید الاسلام علی گڑھ میگزین ص ۲۴۵)

شبلی کی زندگی میں جتنا تضاد ہے اتنے ہی وہ عظیم نظر آتے ہیں اور وہ اسی اندر رنجیدہ اور شکستہ خاطر رہے اور بقول خورشید الاسلام وہ اپنے ماحول میں ایک ناکام دیو زاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بندول ضلع اعظم گڑھ کا یہ مایہ ناز فرزند انقلاب ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوا اور دوسرے انقلاب ۱۹۱۴ء میں اس جہان فانی سے رخصت ہوا ستاون برس کے اس مختصر یا طویل عرصہ حیات کے زمانے نے شبلی کو کیا کیا رنگ نہ دکھائے۔ والد کا دوسرا شادی کر لینا اور کم سن شبلی کا اپنی ماں کی مظلومی اور بدسلوکی پر کڑھنا مشرقی علوم کا حصول جس کو کہ وہ زندگی کی معراج سمجھتے تھے اور پھر اس کی ناقدری کا بھی مزہ اٹھانا وکالت کے امتحان میں ناکامی پھر معاش کے سلسلہ میں تنگی و پریشانی۔ بالآخر زندگی کا بالکل ایک نیا موڑ یعنی علی گڑھ کا جانا اور سرسید احمد خان سے تعارف علی گڑھ کی پروفیسری اور وہاں رہ کر ذہنی اور فکری انقلاب کا آنا یکے بعد دیگرے تاہل اور مایہ ناز بھائیوں کی دائمی جدائی کا صدمہ، پاؤں کا

کرنا۔ ممالک اسلامیہ کی سیاحت۔ ندوۃ العلماء سے وابستگی اور اس کے متعلق جھگڑے اور ان سب کے ساتھ ہی ساتھ عطیہ بیگم اور ان کے خاندان کی صحبتیں۔ گویا کہ مشرق اور مغرب کے آخری سروں کا باہم ملنا اپنے مکتوبات میں بمبئی کی فضاؤں اپالو اور جوہو کی۔ رومان پرور ہواؤں کا ذکر غرض اس مختصر عرصہ حیات میں ہم کو واقعات و اتفاقات کا ہجوم نظر آتا ہے۔

واقعات اور اتفاقات کا شبلی کی زندگی میں کچھ ہی حصہ کیوں نہ ہو ان سے شبلی کی زندگی میں کتنی ہی الجھنیں کیوں نہ پیدا ہو گئی ہوں گو یہ ان کی لغزشیں ہوں یا بڑے غور و فکر کے بعد دیدہ و دانستہ ان سے سرزد ہو گئی ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان واقعات کا ان انقلابات کا ان کی شخصیت اور اسلوب کی تعمیر میں زبردست ہاتھ ہے۔

شبلی کے حالات زندگی بتاتے ہیں کہ ان کی تعلیم مشرقی طرز پر ہوئی تھی انھوں نے پہلے اعظم گڑھ کے مولوی شکر اللہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور پھر مولوی محمد فاروق چڑیا کوٹی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔ مولانا عبدالحق خیر آبادی سے بھی درس لیا ہے آخر میں شبلی کی تشنگیِ علم ان کو لاہور لے گئی۔ اور مولانا فیض الحسن صاحب پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور سے درس لیا۔ اگرچہ شبلی نے اپنے وقت کے چار مستند علماء کی شاگردی کی تھی لیکن ان پر سب سے زیادہ اثر مولوی محمد فاروق کا تھا۔ کیونکہ ان کی صحبت میں عرصہ تک رہے تھے۔ مولوی صاحب موصوف کی اپنے ہونہار شاگرد پر خاص نظر عنایت تھی۔ اس شفقت اور محبت کا

بھی نتیجہ تھا کہ شبلی نے اپنی فکر و نظر کو اپنے استاد کے سانچے ہی میں ڈھال لیا۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جب علوم و ادب سے آراستہ ہو کر زندگی میں قدم رکھا تو۔

"شبلی کی ابتداء یہ تھی کہ انہیں دنیا میں وہابیوں کی تردید سے زیادہ کوئی مشغلہ دلچسپ نظر نہ آتا تھا۔"

(ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب اورینٹل کالج میگزین)

اس بارے میں ان کی سرگرمی اور انہماک اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ سید سلیمان ندوی حیات شبلی میں لکھتے ہیں کہ جب مولانا سنتے کہ فلاں گاؤں یا قصبہ میں کوئی وہابی ہو گیا ہے۔ تو اسی وقت گھوڑے پر زین کسوا کر اس گاؤں میں جا پہنچتے اور مناظرے کا چیلنج دیتے۔ غرض یہ کہ اس نوجوان مولوی کی تمام تر ذہانتیں اور صلاحیتیں ان فروعی اور جزئیاتی مسائل اور اختلافات میں صرف ہو رہی تھیں۔ اور کسی کو گمان بھی نہ تھا۔ کہ یہی چھوٹی چھوٹی جزئیات پر بحث ہونے والا تنگ نظر مولوی ایک دن بہترین مصلح ادیب اور نقاد اسلامیات بنے گا۔ لیکن ۱۸۸۲ء شبلی کی زندگی میں ایک بڑے انقلاب کا باعث بن گیا جبکہ وہ اپنے بھائی مہدی کو کالج میں داخل کرانے کے لئے علی گڑھ گئے۔ اور وہاں سرسید احمد خان سے متعارف ہوئے دونوں کی مردم شناس نظروں نے ایک دوسرے کے جوہر ذاتی کو پرکھ لیا۔ اور سید صاحب کا تو دل گویا بے اختیار پکار اٹھا۔ع۔

"آمد آں یارے کہ ما می خواستیم"

چنانچہ سید صاحب نے فوراً شبلی کو عربی اور فارسی کے پروفیسر کے عہدے کی پیش کش کی ۔ جسے انھوں نے قبول کر لیا۔ اگر شبلی اس کو قبول نہ کرتے تو بہت ممکن تھا کہ شبلی گمنامی کے تاریک غار ہی میں رہ جاتے اور مقلد اور غیر مقلد کی دلدل ہی میں پھنسے رہتے۔ علی گڑھ کی علمی فضا سرسید کی مخلص اور مجسم عمل صحبت نے شبلی کی آنکھیں کھول دیں۔ یہاں آکر ان کو زمانے کی رفتار وقت کے بہاؤ اور قومی تقاضوں کا احساس ہوا اور ان کے زاویہ ہائے نظر اور انداز فکر میں صبر تبدیلی ہوگئی ۔

شبلی کی فکر جدید میں سید صاحب کے کتب خانے کا زبردست حصہ ہے سید صاحب کا کتب خانہ مشرق و مغرب کی بہترین کتابوں کا مجموعہ تھا۔ انھوں نے شبلی کے ذوق علم کو دیکھ کر ان کو اپنے کتب خانے سے استفادہ اٹھانے کی عام اجازت دے رکھی تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

> "میں جس حالت میں ہوں اچھا ہوں سید صاحب نے کتب خانے کی نسبت مجھے عام اجازت دے رکھی ہے اور اس وجہ سے مجھے کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے۔ (مکاتیب شبلی جلد اول صفحہ ۲۰)

سید صاحب کے کتب خانے کے علاوہ ان کے علمی حلقہ میں پریچنگ آف اسلام کے مصنف آرنلڈ صاحب بھی تھے شبلی کے ان سے بہت اچھے تعلقات تھے شبلی نے ان سے فرنچ زبان سیکھی اور ان

کو عربی پڑھائی آرنلڈ صاحب نے پریچنگ آف اسلام کی تصنیف میں شبلی سے بڑی مدد لی۔ اس کتاب کی تصنیف کا مقصد یہی تھا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ اسلام بزورِ شمشیر نہیں پھیلا بلکہ اپنی دل نشین تعلیمات سادہ اور مخلص اصولوں کی بنا پر پھیلا ہے مولانا شبلی اور آرنلڈ جہاز پر ہم سفر بھی رہے اور آپس میں ایک دوسرے پر اظہار خیالات وغیرہ کرتے رہتے تھے۔

آرنلڈ کے علاوہ ڈاکٹر لائٹز کی کتاب سینین الاسلام نے بھی شبلی کو متاثر کیا اور اس کے مطالعہ سے وہ پہلی مرتبہ مغربی طرز تالیف کے دل دادہ ہوئے یورپ کی خدمات اور علوم اسلامیہ کی قدردانی اور نادر کتب کی اشاعت نے ان کے دل سے اس تعصب کو دور کر دیا جو ان کے دل میں مغرب کے خلاف تھا۔

غرض اس طرح رفتہ رفتہ شبلی کے زاویۂ نظر انداز فکر اور اسلوب میں دبے پاؤں ایک انقلاب آتا ہے اور اس میں وسعت اور روشنی پیدا ہوتی گئی۔ اب شبلی نئی تعلیم اور جدید علوم کے اتنے شدید دشمن نہ رہے جتنے کہ پہلے تھے بلکہ وہ اب ان کو خصوصاً انگریزی کو اپنے مجوزہ نصاب اور طریق تعلیم میں جگہ دینے پر تیار نظر آتے تھے ان کا نظریہ تعلیم علی گڑھ میں ایک طویل عرصہ گزارنے کے بعد اس قدر بدل گیا تھا کہ وہ قدیم کو جدید کی مدد سے زیادہ روشن دماغ اور زیادہ دلکش بنا دینا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ جب "الفاروق" کی تصنیف

کے سلسلہ میں انھوں نے بلاد اسلامیہ کا سفر کیا اور وہاں اسی قدیم طریق تعلیم کو پس پشت دیکھا تو وہ بے تاب ہو گئے اور سرسید احمد خان کے نام ایک مکتوب میں نہ صرف افسوس کا اظہار کیا ہے۔ بلکہ اپنے نظریئے اور خیال کی اہمیت پر زور بھی دیا ہے۔

افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بھی بہت چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقہ تعلیم تھا۔ اس میں یورپ کا ذرا پتہ تو نہیں جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے۔ لیکن دونوں کی حد و حدود الگ رکھی گئی ہیں اور جب تک دونوں کے ڈانڈے نہ ملیں کے اصلی ترقی نہ ہو گی یہی کمی تو ہمارے ملک میں ہے۔ جس کا رونا ہے"

از مکتوبات شبلی باب عالی قسطنطنیہ ۵ اجون ۱۸۹۲ء

غرض قدیم و جدید کی تخمیر سے ایک نیا طریق تعلیم رائج کرنے کی دھن میں انھوں نے اپنی بہت سی صلاحیتوں کو دھکا پہنچایا اور بہت سے کارنامے بھی سرانجام دیئے وہ اسلامی عظمت کے پرستاروں میں تھے اور ہمیشہ اسلام کی برتری اور عظمت کو ثابت کرنے کی دھن میں رہتے تھے۔ چنانچہ اسی خیال کی بنا پر انھوں نے سلسلہ ناموران اسلام کی تصنیف اور تالیف شروع کی شبلی نے ناموران اسلام میں سے موضوعات کا انتخاب اپنی ذہنیت اپنے مزاج اور افتاد طبع ہی کے مطابق کیا۔ انھوں نے سوانح نگاری کیلئے اپنے موضوعات کو منتخب کیا۔ جن میں ان کو اپنی آرزوؤں کی تکمیل نظر آتی تھی جن کی شخصیتوں کے پرتو میں وہ تمام اوصاف پائے تھے جن کا حامل وہ خود اپنی شخصیت کو دیکھنا چاہتے تھے

وہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے تھے جب قومی زوال ہر ذی حس مسلمان کے دل میں خلش بن کر کھٹک رہا تھا۔ اور یہ وہ وقت تھا جبکہ

"بلبلیں بھی باروں کی صف میں آکھڑی ہوئی تھیں۔"

(موج کوثر صفحہ ۳۰)

چنانچہ اس زوال کے خلاف وہ بھی برسر پیکار ہوئے۔ مگر ان کا مزاج ایک حساس فنکار کا مزاج تھا۔ ان کا دل شاعر کا تھا۔ وہ نفاست پسند اور شاہانہ مزاج کے مالک تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے الفاظ میں سرمستی اور گرمی پائی جاتی ہے۔

ان تمام خصوصیات نے مل کر ان کے اسلوب میں بڑا انوکھا پن اور بوقلمونی پیدا کر دی ہے۔ اور وہ تاریخ و فلسفہ کے خشک موضوعات کو بھی اپنے قلم کی مناسب اور با موقعہ رنگینی سے گوارا بنا دیتے ہیں۔

شبلی کے سوانحی موضوعات حالی کے موضوعات کی طرح خاموش اور نسبتاً سہل نہیں ہیں۔ شبلی کو چٹانوں سے ٹکرانے میں مزا آتا تھا۔ وہ شیروں کی کچھاروں میں گھس جانے کے قائل تھے۔ ساتھ ہی ان کی شاہانہ طبیعت محلات کے نظاروں سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے وہ موضوعات منتخب کئے جن کی عظمت و جلال کے آگے بڑے بڑے سر جھک چکے تھے۔ انھوں نے فاروق اعظم رضہ کی سوانح عمری تصنیف کی۔ سوانح اور شاہان اسلام میں ان کی نظر انتخاب دور عباسیہ پر پڑی جس میں۔

"روم وایران کی فضائیں زبیدہ کے محلات میں سمٹ آئی تھیں (خورشید الاسلام علی گڑھ میگزین ۱۹۶۵ء)

علماء میں انھوں نے امام ابوحنیفہ اور امام غزالی کو منتخب کیا۔

شبلی کی تصانیف کا آغاز ۱۸۸۱ء میں علی گڑھ کے قیام کے دوران میں ہوا مولانا کو محسوس ہوا کہ انگریز مورخین اسلامی تاریخ کو اس پیرائے میں پیش کر رہے ہیں۔ کہ نئی تعلیم یافتہ نسل کو نہ صرف اپنی تواریخ سے نفرت اور شرم آنے لگے گی بلکہ اس سے ان کے قومی افتخار کو ایسا صدمہ پہونچے گا۔ کہ ان کے فکری اور ذہنی قوی ہمیشہ کے لئے معطل ہو جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے سلسلۂ ناموران سلام کے ماتحت سوانح نگاری کا کام شروع کیا اور "حیات سعدی کے بعد اردو زبان کی دوسری نئی طرز کی سوانح عمری المامون ہے اور مولانا شبلی کی مستقل تصنیف"

(حیات شبلی صفحہ ۱۷۲)

انھوں نے ناموران اسلام کی جو فہرست بنائی تھی اس ترتیب کے لحاظ سے مامون الرشید کا نام تیسرے نمبر پر تھا۔ لیکن چونکہ وہ ہر بات میں تحقیق مطالعہ روایت اور درایت کا التزام رکھتے تھے۔ اس لئے یہ پابندی ان کے بس کا کام نہ تھی۔ اور انھوں نے مناسب یہی سمجھا کہ جس موضوع کے مطالعہ سے مواد مل جائے اسی کو پہلے لکھیں گے چنانچہ انھوں نے المامون ہی میں اس کا اعلان کر دیا تھا کہ "آئندہ بھی شاید میں ترتیب کی پابندی نہ کر سکوں" (دیباچہ المامون صفحہ ۵)

المامون دو حصوں میں منقسم ہے پہلے حصہ میں مامون الرشید کی ولادت تعلیم وتربیت ۔ خانہ جنگیاں ۔ فتوحات ملکی اور وفات تک ۔ پورے حالات درج ہیں اور دوسرے حصے سے ملکی حالات اور مامون کے تمام اخلاق وعادات کا اندازہ ہوتا ہے ۔ "المامون" کے مطالعہ سے فوراً ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی تصنیف سے مصنف کا مقصد خالص سوانح نگارانہ تھا بلکہ انھوں نے یہ التزام رکھا تھا کہ "تاریخ کے ساتھ لالف کا مذاق بھی موجود ہو۔"

(دیباچہ المامون صفحہ ۴)

اور انھوں نے فوراً اعتراف کیا ہے کہ

"یہ حصہ جو قوم کے سامنے پیش کر رہا ہوں مامون الرشید عباسی کی تاریخ ہے ۔" (دیباچہ صفحہ ۵)

چنانچہ اس میں ہم کو سوانح کی صرف جھلکیاں نظر آتی ہیں ہم کو اس سے مامون کے عہد کی تاریخ خانہ جنگیوں سیاسی واقعات کا یہ نسبت اس کی سیرت کے زیادہ اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے ۔ تاہم انھوں نے جس محنت سے تاریخی واقعات اور شواہد کی تلاش کی ہے ۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ خلیفہ کا مرقع دیانت دارانہ طریقہ پر پیش کرنا چاہتے تھے اور ایک انسان کی حیثیت سے انھوں نے اس کی بشری خصوصیات پر نکتہ چینی بھی کی ہے اور ان کی صداقت پسندی نے ان کو اپنے پسندیدہ اور محبوب ہیرو کے متعلق یہ کہنے پر مجبور کر دیا ۔

"اس غیر متوقع فتح کی خوشی نے مامون جیسے رقیق القلب شخص کو بھی سنگ دل بنا دیا کہ اس نے اپنے بھائی کے خون آلود سر کو مسرت کی نگاہ سے دیکھا اور جوش خوشی میں سجدۂ شکر ادا کیا۔"

(المامون صفحہ ۴۶)

اسی طرح اس کا درجۂ اعتدال سے بڑھا ہوا عفو و درگذر خراسان کے امور مملکت سے غفلت اس کے مذہبی عقیدوں میں تعناد کنیزوں اور لونڈیوں سے شغف لیکن ساتھ ہی ہر موقع پہ اس کی شرافت اور محاسن کو بھی دل کھول کر مثالی کردار بنا دیا ہے اور اس دھن میں اس کی خلاف شرع باتوں کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ ان کی تنقید کا انداز رکا ہوا ہے۔ اور کہیں بھی کھل کر تنقید نہیں کی۔

شبلی نے دلچسپ حکایتوں کی تکنیک سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اور موضوع کو خشکی اور بے کیفی سے بچا لیا ہے جہاں کہیں ان کو احساس ہوتا ہے کہ قاری کا ذہن ٹھوس تاریخی حقائق سے بیزار ہو رہا ہے۔ وہ ایسی بات لکھ دیتے ہیں جو دوبارہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے مثلاً ملک کی آبادی امن و امان اور مامون کی بیدار مغزی عدل و انصاف اور غیر قوموں کے حقوق کے بارے میں اطلاعات بہم پہنچانے وقت ان کو اس کا شدید احساس ہوتا ہے اور وہ مختلف واقعات سے مثالیں دے کر موضوع کو دلچسپ اور خوشگوار بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح کہیں کہیں شاعر مزاج شبلی کا قلم بڑی سبک روی سے چلنے لگتا ہے۔ اور قاری مسحور ہو کر اس کے پیچھے

پیچھے چلنے لگتا ہے۔ چنانچہ المامون میں بھی گا ہے گا ہے وہ ہمیں مدینۃ السلام بغداد کی سیر کراتے ہوئے زبیدہ اور ہارون کے محلوں کی الف لیلوی فضاؤں میں لے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"بزم عیش میں وہ رندانہ وضع سے بیٹھتا ہے بے تکلف اور رنگین طبع احباب جمع ہیں۔ پری پیکر نازنینوں کا جھرمٹ ہے دور شراب چل رہا ہے۔ گل اندام کنیزیں نغمہ سرا ہیں۔ یاران باصفا بدمست ہو جاتے ہیں۔"

(المامون صفحہ ۱۵۸)

لیکن اس سب کے باوجود پوری کتاب کا عام انداز مورخانہ ہے اور انھوں نے بڑے محققانہ پیرائے سے کام لیا ہے۔ اور بعض جگہ حواشی کے ذریعہ تاریخی اسناد اور واقعات کی وضاحت کی ہے مثلاً ایک حاشیہ پر لکھتے ہیں۔

علامہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں نہایت سختی کے ساتھ مامون وغیرہ کی بادہ نوشی سے انکار کیا ہے لیکن تاریخی سند کوئی پیش نہ کر سکے۔ صرف حسن ظن پر تقریر کو طول دیا ہے تاہم نبیذ کا پینا تسلیم کرتے ہیں۔ ابن خلدون کے تسلیم کرنے والے مجاز ہیں کہ ہماری کتاب میں مامون کی نسبت جہاں شراب کا ذکر آئے وہاں بجائے شراب کے نبید پڑھیں۔" (حاشیہ صفحہ ۱۵۸)

بعض جگہ تو مورخانہ تفصیلات کی ایسی بھرمار ہے کہ پڑھنے والا اُبھرا اٹھتا ہے لیکن یہ تفصیل بے مقصد نہیں ہوتی اس سے مامون اور اس کے عہد کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شبلی اُردو کے تہی دامن کو معلومات کے بیش قیمت خزانے سے مالا مال کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ اردو داں طبقہ جو اس وقت تک اسلاف کے حالات اور عظمتوں سے بے خبر تھا اس سے آگاہ ہوسکے۔

ابواب کی لمبی لمبی سرخیوں نے ان کے طرزِ بیان کو میکانکی بنا دیا ہے پورے مواد سے صرف سرخیاں پڑھنے ہی سے آگاہی ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے ذہن پر وہ پراسرار کیفیت طاری نہیں ہوتی جو کسی نامعلوم چیز کے آہستہ آہستہ منکشف ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ ایک کمزوری جو شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے وہ کتاب کا اچانک خاتمہ ہے۔ آغاز تو انھوں نے بہت احتیاط اور باریکی سے کیا ہے واقعات کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے کی کوشش اور تفصیلات وجزئیات میں۔ فکر وتحقیق کو مشغول رکھا ہے لیکن آخر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والا اکتا گیا ہے۔ اور جو ں توں کتاب ختم کر دی ہے اس خاتمہ نے کتاب کے تناسب اور ہم آہنگی پر اثر ڈالا ہے۔

المامون کے بعد شبلی کی دوسری تصنیف میں جس میں سوانح نگاری کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ سیرۃ النعمان ہے۔ یہ ۱۸۹۱ء میں لکھی گئی ہے

المامون کے دیباچہ میں اگرچہ مولانا اس بات کا اعلان کر چکے تھے کہ
فہرست کی ترتیب کی پابندی ان سے نہ ہو سکے گی تاہم یہ خیال ضرور ہوتا
تھا کہ اس کے بعد خلافت عباسیہ ہی میں سے کسی کو منتخب کریں گے لیکن
مولانا نے ایک دم امام ابوحنیفہؒ کی سوانح عمری کی طرف توجہ کی اس کا
بڑا سبب وہی شبلی کی تلاش اور روایت پسندی تھا۔ انھوں نے المامون
کے بعد خاطر خواہ مواد اور اطلاع نہ ملنے کی وجہ سے الفاروق لکھنا
شروع کی لیکن اس سلسلہ میں بھی وہی دقت درپیش تھی اور اس سلسلہ
کی بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لئے نہایت ضروری تھیں۔ یورپ
میں چھپ رہی تھیں۔ چنانچہ اس انتظار میں الفاروق کی تصنیف
التوار میں پڑ گئی اور اس۔

در زمانہ انتظار میں بیکار بیٹھنا تو مشکل تھا۔ خیال ہوا کہ
کسی اور نامور کی تالیف شروع کر دوں۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ
الفاروق ناتمام ہے طبیعت رک جاتی تھی اور اس تامل میں ایک قدم
آگے نہ بڑھ سکتا تھا ادھر یہ علتش چین نہ لینے دیتی تھی کہ علمی نام اوروں کے کارنامے
دکھانے بھی ضرور ہیں۔ (سیرۃ النعمان صفحہ ۱۴)

چنانچہ المامون کے بعد بجائے کسی دوسرے شاہنشاہ یا سپہ سالار
کے اہل علوم و فنون کی کشش نے اپنی طرف راغب کیا اور وہ سب
سے پہلے علم فقہ کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کو اس
اس کا ہیرو قرار دیا۔ اس کے علاوہ چند وجوہات اور تھیں۔ اول

تو یہ کہ انگریزی میں امام صاحب کی متعدد سوانح عمریاں موجود تھیں۔ ایسی صورت میں اردو میں جس کے بولنے والوں کی کثیر تعداد انہی کا پیرو تھی امام صاحب کی سوانح عمری نہ لکھا جانا قابل شرم تھا۔ اس کے علاوہ شبلی کو امام صاحب سے دلی تعلق اور لگاؤ تھا۔ ان کی افتاد طبع امام صاحب کے اندر وہی خوبیاں اور خصوصیات دیکھ رہی تھی جو اس کا مطمع نظر اور مقصود تھا۔ ممکن ہے کہ انھوں نے بھی امام صاحب کی سوانح عمری لکھ کر وہی تسکین قلب محسوس کیا ہو جو سید سلیمان ندوی نے شبلی کی سوانح عمری کو لکھ کر محسوس کی

سیرۃ النعمان کے دو حصے ہیں پہلا حصہ حالات زندگی پر مشتمل ہے دوسرا حصہ ان کے کارناموں پر روشنی ڈالتا ہے حالات زندگی تعلیم وتربیت عادات اور خصائل کے علاوہ امام صاحب کے اصول اور مسائل پر جو علم الکلام اور فن حدیث میں ان کا کیا پایہ تھا۔ فن فقہ پر بھی تفصیلی ریویو ہے ساتھ ہی امام صاحب کے نامور اور ممتاز شاگردوں کا بھی مختصر ذکر ہے۔

اس کتاب کی تصنیف میں مولانا کو ایک آسانی یہ بھی تھی کہ امام صاحب کی بکثرت سوانح عمریاں عہد قدیم سے لکھی جا چکی تھیں اور اور مولانا شبلی کو حسب منشا مواد حاصل ہو گیا۔

سیرۃ النعمان میں شبلی نے انہی باتوں اور واقعات کو اہمیت دی ہے جو عقل وادراک کے معیار پر پوری اترتی ہیں محض خوش اعتقادی

سے پیدا شدہ واقعات پر زور نہیں دیا۔ مثلاً امام صاحب کے تیس برس تک روزے رکھنے اور محض شک کی بنا پر بکری کا گوشت چھوڑ دینے سے دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ اسی طرح غیر مستند اور تاریخی اعتبار سے کمزور بیانات سے اپنے مرقع میں رنگ بھرنے سے گریز کیا ہے۔ اور ان کی یہی خصوصیات ان کو دوسرے سوانح نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔

"انھوں نے بے باکی ہمہ گیری اور آزادروی کا ایسا مرقع تیار کیا ہے۔ جس میں حقیقت زیادہ اور اعتقاد کم ہے"

امام صاحب کی ذہانت اور فطانت کو اجاگر کرنے کے لیے بڑا اچھا اسلوب اختیار کیا ہے واقعات نگاری نے قاری کا ذہن مٹھی میں لے لیا ہے ان کے کردار اور سیرت کو پیش کرنے کے لئے ایسے ماہرانہ حربے استعمال کیے ہیں کہ ہم پر امام صاحب کی طباعی کا رعب بھی پڑتا ہے اور ان کی شخصیت کے سربستہ پہلو بھی نمایاں ہو جاتے ہیں دلی ارادت کے باوجود اظہار رائے سے باز نہیں آئے ہیں۔

شبلی نے اب تک جتنی سوانح عمریاں لکھیں ان سب پر الفاروق اپنے مواد کی تشکیل سوانح نگارانہ تکنیک اور مصنف کی ذاتی دلچسپی کے لحاظ سے نمایاں فوقیت رکھتی ہے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سوانح نگاری اور اس کی تحقیق میں گزرا انھوں نے الفاروق کا مواد بڑی محنت سے جمع کیا یہاں تک کہ ان کا شوق تجسس ان کو روم

و شام کے کتب خانوں میں لے گیا۔ جہاں سے انھوں نے اپنی مایۂ ناز تصنیف کے لئے بیش قیمت سرمایہ اور مواد فراہم کیا۔ اور پھر ان کے جوہر نے تاریخی صحت کے علاوہ اپنے موضوع سے پوری طرح واقفیت بہم پہنچائی۔ انھوں نے تاریخ کے اس بے ترتیب اور لاتناہی سلسلہ میں موضوع سیرت کو صحیح رنگ میں دیکھا۔ مشاہدہ اور مطالعہ کے علاوہ شبلی کو فاروق اعظم رضؓ کی سیرت میں اس خاص قوت اور کردار جھلک نظر آئی جس کے وہ متلاشی تھے اور۔

"شبلی کے لئے الفاروق ایک ایسا موضوع تھا جس کے لئے وہ شاید خاص طور پر موزوں تھے۔"

(موج کوثر صفحہ ۲۲۹)

اپنی دوسری تصانیف کی طرح الفاروق میں بھی شبلی نے تاریخی اسباب وعلل کو سوانح وسیرت کے باب میں مقدم سمجھا ہے۔ چنانچہ وہ الفاروق میں بھی اپنے دیباچہ میں اس کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کسی مصنف کا قول نقل کرتے ہیں۔

"فطرت کے واقعات نے انسان کے حالات میں جو تغیرات پیدا کئے ہیں اور انسان نے عالم فطرت پر جو اثر ڈالا ہے ان دونوں کے مجموعہ کا نام تاریخ ہے"

(الفاروق صفحہ ۱۴)

ان کا خیال تھا کہ کسی کی سوانح نگاری کے سلسلہ میں سوانح نگار

کا فرض ہے کہ اس تاریخی ماحول اور سیاسی پس منظر کا پتہ لگائے جس میں اس کی شخصیت کی تشکیل اور کردار کی تعمیر ہوتی ہو۔ ساتھ ہی مورخ کا فرض یہ بھی ان کے پیش نظر رہتا ہے یعنی سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہیں کرتے اس معاملہ میں وہ پروفیسر رینگی کی تقلید کرنا چاہتے ہیں اور اس کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ۔

"اس نے تاریخ میں شاعری سے کام نہیں لیا۔ وہ نہ ملک کا ہمدرد بنا نہ مذہب اور قوم کا طرف دار ہوا کسی واقعہ کے بیان کرنے میں مطلق پتہ نہیں لگتا کہ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور اس کا ذاتی اعتقاد کیا ہے۔"

(الفاروق صفحہ ۲۰)

اسی خیال کے پیش نظر وہ بڑی گہرائی اور سنجیدگی سے اس سیاسی ماحول اور تجربات کا جائزہ لیتے ہیں جن میں فاروق اعظمؓ کی شخصیت تدریجی مراحل طے کرتی رہی تھی پھر ان تمام امور کا ذکر کیا ہے۔ جن پر ان کی شخصیت اثر انداز ہوتی رہی۔ یعنی ان کا دور اثر۔ انتظام مملکت انتظامی پالیسی دستور کی تدوین اور تمدن کے مسائل قومی مزاج کی تشکیل اور وہ تمام قوتیں جنہوں نے قلیل مدت میں دنیا کا ڈھانچہ بلحاظ تہذیب و تمدن بدل دیا اور اس طرح ان کی سیرت کے کئی رخ واضح ہو گئے۔

فاروق اعظمؓ کی ہمہ گیری سے متعلقہ مسائل کے پس منظر میں ان کے کردار کو واضح کرتے جاتے ہیں انھوں نے اپنے نقطہ نظر اور آئیڈیل

کو فاروق اعظمؓ کے روپ میں دیکھا اور انسانی عظمت اور ذہانت کی اس منزل سے مرعوب ہونے کے بجائے مسرت اور تسکین محسوس کرتے ہیں۔ وہ اپنے سے زیادہ عظیم المرتبت شخصیت کو اپنے تصور سے زیادہ جلیل و عظیم دیکھ کر بے حد مسرور و محظوظ ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنے ہیرو کی شخصیت کو اجاگر کر کے ایک ذہنی تسکین حاصل کرتے ہیں

الفاروق میں شبلی کا فنی شعور در بہ کمال پر نظر آتا ہے اور وہ ایک اہم اور مشکل تکنیک سے بڑی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ یعنی یہ کہ آں حضرت کے حالات کے ضمن میں کئی ثانوی کردار آتے ہیں۔ جو بذات خود اہم اور دلچسپ جاذب توجہ ہیں اور اس درجہ زبردست ہیں کہ پڑھنے والے کی توجہ بڑی آسانی سے مرکزی کردار سے ہٹ کر ان کی طرف مرکوز ہو سکتی ہے۔ خود آنحضرتؐ ہی کی عظیم و مکمل شخصیت ہی قاری کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لیتی ہے لیکن شبلی کی صلاحیت اور فنکارانہ شعور بڑی چابکدستی سے اپنے چراغ کی لو کو اس نیّر درخشاں کے سامنے کسادبازی رہنما ہے

اسی طرح خالد بن ولیدؓ کی دلچسپ اور جرّار شخصیت بھی کچھ کم جاذب توجہ نہیں ہے۔ پھر تینوں صحابہ کرام صدیق اکبرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی شخصیتیں اپنی اپنی جگہ پر محبوب اور مسلّم ہیں۔ لیکن ان سب کے درمیان شبلی کے ہیروؓ کا پرجلال اور روشن چہرہ بدستور مسکراتا ہوا اور نمایاں نظر آتا ہے۔

اسی طرح شبلی اپنے ہیرو کو بڑے بڑے نازک مرحلوں سے اس طرح نکال لے گئے ہیں کہ اس پر حرف نہ آنے پائے۔ چنانچہ۔۔۔

خالد بن ولید کی معزولی کا واقعہ کمال ہنرمندی اور مشاقی سے بیان کر کے اپنے ہیرو کو اس مرحلے سے صحیح وسالم نکال لے جانا انہی کا کام تھا۔

اگرچہ الفاروق کا بڑا حصہ حضرت عمرؓ کے تدبر اور ملکی انتظام کی جزئیاتی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ لیکن شبلی نے ان کی ذاتی قابلیت، سیرت، مذاق شعر و ادب، علمی رجحانات اور فطری سادگی کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔ ساتھ ہی اپنی دیانت داری اور فطری استدلال کی بناء پر موضوع کی روح کو سمجھنے میں بڑے غور و فکر سے کام لیا ہے اور اسی روح کی بے نقابی نے الفاروق کو بہترین سوانح عمری بنا دیا ہے۔ انھوں نے حضرت عمرؓ کو مجسم پیش کر دیا ہے۔ ان کی صفات اور عادات کو بلا ترجیح پیش کر کے ان کے متعلق رائے اور فیصلہ قاری کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ غرض الفاروق میں ہم شبلی کی فنی پختہ کاری کے قائل ہو جاتے ہیں۔

الفاروق کے بعد الغزالی کا نام آتا ہے۔ یہ مولانا کی ان تصانیف میں سے ہے جو انھوں نے حیدرآباد میں کی تھیں۔ شبلی کے حالات سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ حیدرآباد میں ان کا تصنیفی محور بدل گیا۔ یہاں زیادہ تر وہی تصانیف کیں جو علم الکلام سے متعلق ہیں اور یہاں آکر مولانا پر یہ رنگ اس درجہ غالب تھا کہ۔

"غزالی اور رومی کی سوانح عمریوں کو بھی علم الکلام کی کتابیں بنا دیا۔" (شبلی نامہ صفحہ ۱۲۲)

دراصل نہ تو الغزالی کو ایک کامیاب سوانح عمری کہا جا سکتا ہے اور نہ خود شبلی نے اس کو سوانح نگاری کے مقصد سے لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کی وجہ تخلیق تو علم کلام کی تاریخ ہے جیسا کہ خود انھوں نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے۔

"پہلا حصہ بقدر معتدبہ لکھا جا چکا تھا کہ بوجوہ چند رک گیا اور تیسرا حصہ شروع ہوگیا۔ اس حصہ میں امام غزالی کی سوانح عمری شروع ہو گیا۔ تو بڑھتے بڑھتے مستقل کتاب بن گئی۔ چونکہ پوری کتاب کی تیاری کو عرصہ درکار تھا مناسب معلوم ہوا کہ بلا انتظار باقی حصہ یہ حصہ الگ شائع کر دیا جائے۔ امام صاحب کے حالات میں ان کے اصول عقائد اور استدلال کی تفصیل لکھی ہے۔ اس طرح علم کلام کے اکثر مہتم بالشان مسائل بھی اس کتاب میں آ گئے ہیں؛"

(الغزالی دیباچہ صفحہ ۱)

الغزالی کی تصنیف کا مقصد فن سوانح نگاری کی تسکین یا نمائش نہ تھا بلکہ علماء کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ایک خاص سطح پہ لانا تھا چنانچہ مہدی حسن کو لکھتے ہیں۔

"میں علماء وغیرہ کو جس سطح پر لانا چاہتا ہوں اس کے لئے زینہ درکار ہے الغزالی پہلا زینہ ہے۔"

یہی سبب ہے کہ ہم کو الغزالی میں فنی اعتبار سے جھول اور

تناقصات بکثرت ملتے ہیں۔ پہلی بات جو کھٹکتی ہے وہ مواد کا بے ترتیبی سے پھیل جانا ہے۔ اس کا احساس خود شبلی کو بھی ہے لکھتے ہیں کہ۔

"بے شبہ غزالی کو بہت کچھ سمیٹنا ہے اور اس میں چند در چند اسباب جمع ہو گئے۔"

جہاں تک چھان بین اور تفتیش کا تعلق ہے شبلی یہاں بھی مستقل مزاج اور ثابت قدم نظر آتے ہیں۔ اور سوانحی صداقت کے رکارڈ کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ امام غزالی کی سوانح عمری پر عربی میں بھی کوئی مستقل تصنیف نہیں ملتی اردو کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ البتہ مختلف رجال اور دوسری کتب میں جستہ جستہ واقعات مل جاتے ہیں۔ شبلی نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا اور مغربی تصانیف سے بھی مدد لی۔ اس کے علاوہ خود تاریخ اسلام پر زبردست عبور رکھتے تھے اور زیادہ تر مواد خود ان کی معلومات کا سرمایہ تھا۔

اگرچہ شبلی کا مقصد سوانح نگاری نہ تھا اور نہ انھوں نے زیادہ زور امام غزالی کی سیرت کو نمایاں کرنے پر دیا ہے اور الغزالی میں جزئیات کی مصوری کا فقدان ہے تاہم موٹے موٹے واقعات کو اس طرح پیش کر دیا ہے کہ ان کے بنائے ہوئے خاکے پر چل کر کوئی بھی اچھا سوانح نگار اعلیٰ پیمانے پر غزالی کی سوانح عمری لکھ سکتا ہے۔

شبلی کو ماحول کی عکاسی کا بڑا خیال رہتا ہے اور اسلامی تہذیب

سے ان کو گہرا لگاؤ ہے۔ چنانچہ الغزالی میں اس دور کے پیشوں اور تعلیم کے ذیل میں امام الحرمین اور نظام الملک طوسی کے بارے میں کافی تفصیل سے کام لیا ہے۔ گاہے گاہے اپنے زمانے کی حالت کا اس دور سے مقابلہ بھی کیا ہے۔

ایک اچھی اور کامیاب سوانح عمری میں شعری قدر اور حسن کی موجودگی بھی ہونا ضروری ہے یعنی جس طرح شاعر قافیہ اور ردیف کی تکرار سے اپنے اشعار میں نغمگی اور آہنگ پیدا کر کے شعر کو خوشگوار بنا دیتا ہے۔ اسی طرح ایک اچھا سوانح نگار اپنے ہیرو کی امتیازی خصوصیت کا اعادہ تھوڑے وقفے سے کر کے اس میں حسن پیدا کر دیتا ہے۔ انسانی زندگی کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں ایک نہ ایک ایسا وصف ہوتا ہے جو اس کی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرتا ہے۔ سیرت نگار کا فرض ہے کہ وحدت تاثر کی خاطر اس کا پتہ لگائے چنانچہ شبلی نے امام صاحب کی جاہ پسندی کو بھانپ لیا ہے چنانچہ الغزالی میں ان کے ہیرو کی شخصیت اس محور (جاہ پسندی) کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔

"درس و تدریس کی طرف طبیعت کا میلان اس وجہ سے تھا کہ وہ جاہ پرستی اور شہرت عامہ کا ذریعہ تھی۔"

(الغزالی صفحہ ۲۶)

اس کے علاوہ تجسس اور تلاش حق کے باوجود ان کا ذہن اور نفس اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا کہ عظمت و جاہ کے خیال سے دستبردار ہو جائیں

اور مدرسہ نظامیہ کی مدرسی چھوڑ دیں۔ اسی طرح دنیا سے کنارہ کش ہونے کے بعد بھی یہ جذبہ ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور بار بار ان کے ذہن میں اپنے مجدد ہونے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس شعری قدر کی تکنیک کا احترام کرنے کے باوجود شبلی نے الغزالی کے ہیرو کا حق تصنیف ادا نہیں کیا ان کا ہیرو متنوع شخصیت اور کردار کا مالک تھا۔ جس کا علم و فضل مسلم تھا۔ اور جس کے تصنیفی کارنامے مستند تھے ساتھ ہی اس کی زندگی کی داستان بڑی ہنگامہ آرائیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ان کی شخصیت بڑی انوکھی تھی جو کبھی تو ترک دنیا پر آمادہ ہو کر جنگلوں کی خاک چھاننے لگتی اور کبھی ان کو جاہ طلبی کی آرزو میں دربار وں میں لے جاتی۔ چنانچہ موضوع کے اعتبار سے غزالی کو ایک زندہ اور سرگرم تصنیف ہونا چاہیے تھا لیکن بقول اکرام صاحب۔

"یوں تو ان کی حیدر آباد کی ساری تصانیف پر ایک بے جان تکلف چھایا ہوا ہے۔ لیکن غزالی اور مولانا روم کی سوانح عمریوں سے خاص طور پر مایوسی ہوئی ہے۔ (شبلی نامہ صفحہ ۱۱۲)

لیکن مولانا کے دیباچہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ دراصل یہ سوانح عمری ہے ہی نہیں بلکہ اس کو تاریخ علم الکلام کا ضمیمہ کہہ سکتے ہیں جس میں سوانح نگاری کے زبردست عناصر اور گہرا شعور پایا جاتا ہے

حیدر آباد میں لکھی ہوئی کلامی تصانیف کے سلسلہ ہی میں سوانح مولانا روم کا نام آتا ہے اور مولانا نے خود اس کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے کہ

"سلسلۂ کلامیہ کا چوتھا نمبر ہے مولانا کے واقعات عام تذکروں میں مختصر ملتے ہیں لیکن اس نقصان کی تلافی اس طرح کر دی گئی ہے کہ مولانا کے کلام اور بالخصوص مثنوی پر نہایت مفصل تبصرہ ہے۔"

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب سیرت نگاری سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ اصل مقصود مثنوی کے ذریعہ علم الکلام کے مسائل کی تشریح ہے جس میں مولانا جلال الدین رومی ایک مرکزی حیثیت کے مالک ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت کا مکمل اور واضح مرقع پیش کرنا نہ تو مقصود تھا۔ اور نہ پیش کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تحقیقی اور غیر روایتی طریقہ اختیار کرنے کے باوجود مخصوص اور مشہور عام واقعات کے سوا کچھ اور درپیش کرنے سے مصنف قاصر رہا ہے۔ زندگی اور سوانح کے ارتقار میں تدریجی مراحل معدوم ہیں پیدائش کے ذکر کے بعد ہی اٹھارہ (۱۸) سال کی عمر کے حالات بیان کرنے لگتے ہیں پھر ایک دم ان کی عمر کے چالیسواں سال پر آجاتے ہیں اور چند واقعات کے بعد وفات کا ذکر آتے ہیں اور اس طرح ہم ان کے شخصی اور ذہنی ارتقار سے قطعًا واقف نہیں ہوتے۔ اور نہ ان کی انفرادیت کی وضاحت ہوتی ہے اس ضمن میں ان کے محاسن اور فضائل

کی ایک فہرست درج کر دی ہے جو بے کیف فہرست سے زیادہ کچھ اور نہیں کہی جا سکتی۔

شبلی کے دوست مشاہدے اور شوقِ تجسس نے کتاب کی لاج رکھ لی ہے۔ انھوں نے درست اور مستند روایات سے کام لیا ہے۔ ایک اور نئی بات یہ بھی ہے کہ عام سوانح نگاروں کے برعکس جو اخلاقی اور اصلاحی پیغام کے پیشِ نظر سوانح عمریاں لکھتے ہیں۔ شبلی اپنے موضوع کے محاسن کی تشہیر اور عیوب کی پردہ داری کے قائل نہیں۔

سوانح مولانا روم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کی نظر میں سوانح کا ہیرو اس درجہ محبوب اور محترم نہ تھا جتنا اس کا کارنامہ وہ اس ضمن میں یہ امر قطعی نظر انداز کر گئے کہ شخصیت ہی کارنامے کو حسن و عظمت عطا کرتی ہے اور کارناموں کی اہمیت شخصیت ہی کی مرہون منت ہے۔

شعر العجم کو ہم سوانح نگاری تو کسی طرح نہیں کہہ سکتے البتہ شعرائے ایران کا تذکرہ ضرور کہہ سکتے ہیں۔ اس میں شعراء کے حالات اس قدر اختصار سے لکھے ہیں کہ ان کو سوانح نگاری میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ان خاکوں سے ہم صرف یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کون سا شاعر کس زمانے میں ہوا اور اس کی خارجی زندگی کے کون کون سے نمایاں واقعات ہیں۔

البتہ بعض واقعات اور حکایات سیرت کے پہلو پر مدھم سی روشنی ڈالتی ہیں۔ مثلاً فردوسی کے احساسات کا مرقع بڑی اچھی طرح کھینچا ہے اور اسی حکایات آمیز تحریر سے شبلی ان بے جان خاکوں میں دلچسپی اور دلکشی پیدا کرتے ہیں اسی طرح شخصیتوں کی سیرتوں کے بعض منفرد پہلو پیش کر کے ان مختصر لیکن بلیغ خاکوں کو یادگار ہونے سے بچا لیا ہے۔ اس کے علاوہ ان میں ایک اور سبب سے بھی جان پڑ گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس میں بڑی بڑی تاریخی اور مذہبی شخصیتوں کا بیان نہیں ہے جن کا احترام مصنف اپنے اوپر واجب سمجھتا بلکہ یہ آزاد رنگین طبع شعراء کی داستانیں ہیں۔ اور ان کے اظہار میں شبلی اخلاقی دباؤ سے آزاد ہو کر اپنے فن کو آزادی سے استعمال کرتے ہیں۔ تکنیک اور موضوع کے لحاظ سے شعر العجم قدیم تذکروں سے مشابہت رکھتی ہے۔ لیکن اس کے طریق کار میں پھیلاؤ اور وسعت زیادہ ہے۔

شعر العجم میں شبلی کو بڑا وسیع میدان ملا تھا۔ مختلف زمانوں کے مختلف شعراء کے متنوع اور گوناگوں واقعات کو فطرت تخیل اور تصور کی دنیا میں رہنے والے شعراء کی فطرتوں کے نئے نئے پہلو اور انوکھے واقعات کو دیکھنے اور پیش کرنے کا بہت اچھا موقع تھا اور ان کو بڑے پیمانے پر پیش کر سکتے تھے لیکن اس کتاب کی تصنیف کا بھی اصل مقصد سوانح نگاری نہ تھا۔ بلکہ ابتدائی شاعری کی ایک مختصری تاریخ پیش کر کے فارسی کا مٹتا ہوا مذاق قائم کرنا تھا۔ اور ساتھ ہی فارسی شاعری پر تنقید بھی تھا

اسی سلسلہ میں شعراء کا ذکر آیا۔ اور سوانحی عنصر بھی شامل ہوگیا۔

شبلی کی آخری اور زبردست ترین تصنیف سیرۃ النبی ہے اور شاید یہی ان کی زندگی کی انتہائی آرزو اور معراج تھی۔ چنانچہ مختلف سوانح عمریوں کی تصنیف کے بعد انھوں نے اپنے قلم کی تمام تر فنی پختگی کو سیرت النبیؐ کی تصنیف اور تالیف کے لئے وقف کر دیا۔ اس منزل تک پہونچنے میں اپنی تاخیر کا باعث یہ بتاتے ہیں :-

عجم کی مدح میں عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا۔
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتمؐ
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

دراصل ان کا یہ خاتمہ بہت ہی عظیم اور شاندار ہے اور ان کا زندہ جاوید کارنامہ ہے اگرچہ سلسلہ ناموران اسلام کے متعلق قلم اٹھاتے وقت اور بعد میں بھی ان کے اور دوسروں کے دل میں یہ خیال بار بار آتا رہا کہ سب سے مقدم اس نامور کا نام آنا چاہئے جس نے سب کو نامور بنایا ہے لیکن یہ کام آسان نہ تھا۔ یہ جتنا محبوب اور پسندیدہ تھا۔ اتنا ہی مشکل اور نازک تھا۔ یہ وہ راہ تھی جس کو طے کرتے وقت عرفی جیسے قادرالکلام شاعر کے قدم بھی کانپ رہے تھے اور اس کو اعتراف کرنا پڑا تھا کہ

"عرفی مشتاب ایں رہِ نعت ست نہ صحرا
آہستہ کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے و جم را

تاہم اس کام کی اہمیت اور نزاکت کے احساس کے باوجود شبلی فضائل واخلاق کا وہ پیکرِ مجسم پیش کرنے کے لئے مضطرب رہے "جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل تھا۔

انھوں نے الفاروق اور الغزالی کی تکمیل کے بعد ۲۸ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ مطابق ۵ جون ۱۹۰۳ء کو حیدرآباد ہی میں اس مبارک کام کو شروع کیا اور ۲ھ تک کے واقعات قلم بند کر لئے لیکن

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس انداز سے وہ اس کو لکھ رہے تھے وہ خود ان کو پسند نہیں آ رہا تھا۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اس کو راز رکھا اور سارے مکتوبات میں کہیں ایک حرف بھی اس کے متعلق اپنے دوستوں میں سے کسی کو نہیں لکھا۔"

(حیات شبلی صفحہ ۷۰۰)

دراصل ان کے ذہن میں سیرت کا معیار بہت بلند تھا۔ ان کا قول تھا کہ

"سیرت ایسی لکھنی چاہیئے جس میں صاحب سوانح کا پایہ اونچا نظر آئے۔ لیکن ہم مسلمانوں کے دلوں میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت کا پایہ اتنا اونچا ہے کہ کوئی کتاب اس بلندی پر نہیں پہنچ سکتی۔ اس لئے سیرت کی کوئی کتاب مشکل ہی سے اس معیار پر پوری اتر سکتی ہے"

اور شبلی اسی کشمکش و پیچ میں اور سیرت کو بلند سے بلند تر معیار پر پیش کرنے کی فکر میں تھے دوسری طرف سے مسلمان بار بار ان سے ایسی تصنیف کا مطالبہ کر رہے تھے جو اس بے خبری اور غلط فہمی کو دور کر سکتی جو نئی تعلیم والوں اور آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یورپین سوانح نگاروں نے اسلام اور رسول اکرمؐ کے خلاف پھیلا دی تھی۔ آخر اکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیتھ کی تصنیف نے اس تذبذب کو ختم کر دیا یہ کتاب اپنی تحقیقات اور احادیث کے حوالوں کے باعث بڑے مسموم اثرات کی حامل تھی جس سے انگریزی داں طبقہ نہایت متاثر تھا۔ جس کا مولانا محمد علی مرحوم کو پہلی مرتبہ احساس ہوا جیسا کہ انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں سید سلیمان ندوی کو لکھا ہے۔

یاد ہے ۱۹۰۶ء میں مولانا استاذنا شبلی مرحوم بڑودہ میری دعوت پر تشریف لائے اور میرے ہی پاس مقیم تھے اس زمانے میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تو فرمائیے کہ سیرۃ نبوی کا کیوں انتظام نہیں فرماتے۔ ہندوستان میں کون ہے جو کفار کے پے در پے مگر بے جا سے بے جا حملوں کا جواب دے گا خصوصاً اپنے آکسفورڈ کے استاد مارگولیتھ کی طرف اشارہ تھا۔ نہ معلوم اس سے قبل مولانا مرحوم کو کتنی بار اس مقدس کام کا خیال آیا ہوگا۔ مگر طرزِ گفتگو سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ میری تقریر نے اثر کیا اور آخری فیصلہ کم سے کم بڑودہ ہی میں رہ کر کیا۔ اھ

(مخطوط محمد علی مکتبہ جامعہ حیات شبلی صفحہ ۵۹)

غرض شبلی جس قدر اس کام کو مشکل سمجھ رہے تھے اسی قدر اس کی اہمیت کا بھی اندازہ ان کی نظر میں بڑھتا جا رہا تھا۔ اور اس بات کا اظہار انھوں نے الندوہ کی تحریروں میں بھی کیا ہے۔ ان کو بخوبی احساس اور اندازہ تھا کہ جدید تعلیم بڑی سرعت سے پھیلی جا رہی ہے اور یہی جدید تعلیم یافتہ گروہ نئی نسل کی قسمتوں کا مالک اور ذہن وفکر کا رہنما ہوگا۔ اگر یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو اردو میں کوئی مستند کتاب نہیں ملتی۔ چار و ناچار انگریز سیرت نگاروں کا سہارا لینا پڑتا ہے جن کی تصنیفات میں یا تو ناواقفیت کی بنا پر ہر موقع پر غلطیاں ہیں یا واقعات کو حسب منشا توڑ موڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔

اس خیال کے پیش نظر شبلی نے سیرۃ النبیؐ پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کرلیا۔ یہ کام بظاہر نہایت آسان تھا۔ عربی زبان میں سینکڑوں کتابیں موجود تھیں۔ ان کو سامنے رکھ کر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھ دینا چند مہینوں کا کام تھا لیکن بقول خود ان کے

"واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس سے زیادہ دیر طلب اور جامع مشکلات نہیں ہوسکتی۔"

(دیباچہ سیرۃ النبی صفحہ ۸)

ممکن ہے شبلی سیرۃ النبیؐ کی تصنیف و تالیف میں اس درجہ

حزم واحتیاط سے کام نہ لیتے۔ اگر ان کے پیش نظر اس کی ضرورت اور اہمیت کا عالمگیر نظریہ نہ ہوتا۔ لیکن چونکہ ان کو یقین تھا کہ اس درجہ مقدس ہستی کی سوانح عمری کی تمام عالم کو ضرورت ہے۔ یہ محض اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں بلکہ

"ایک علمی ضرورت ہے ایک اخلاقی ضرورت ہے ایک تمدنی ضرورت ہے ایک ادبی ضرورت ہے۔"

(دیباچہ سیرۃ النبیؐ صفحہ ۸)

اور چونکہ وہ ایک عالمگیر فرض کو انجام دے رہے تھے۔ اس لیے وہ اس میدان میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے اپنے تمام تر حقیقی اور فنی حربوں کے ساتھ اترے۔

وہ فن سوانح نگاری سے بخوبی واقف تھے اور اس کے متعلق چند نظریے بھی رکھتے تھے اور علوم و فنون کی صف میں بیا گرافی کا ایک خاص درجہ سمجھتے تھے ان کے نزدیک ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے حالات زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لئے دلیل راہ بن سکتے تھے اور وہ سوانح نگاری میں صاحب سوانح کے خیالات مقولوں اور حالات کا احترام کرنا بھی سوانح نگار کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

"چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہش رکھتا ہے۔ کیا کیا منصوبے باندھتا ہے اپنے چھوٹے سے دائرہ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے (دیباچہ سیرۃ النبیؐ)

غرض ان کے نزدیک ایک غریب مزدور اور سکندر اعظم دونوں کے عرصۂ حیات میں نتیجہ رسی اور عبرت پذیری کے عناصر موجود ہیں اور ایسی صورت میں "تخص" کا سوال نظر انداز ہو جاتا ہے۔ صرف واقعات کی تفصیل رہ جاتی ہے کہ وہ کس انداز اور صورت سے صاحب سوانح کی زندگی میں رونما ہوئے اور اس پر اثر انداز ہوئے۔ اب یہ ان کی اور ان کے فن کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو سوانح عمری کے لیے فرد کامل اور استقصائے واقعات دونوں چیزیں بیک وقت مل گئیں۔

انھوں نے بڑی محنت سے معترضین کے اعتراضات فراہم کیے فنِ سیرت النبی سے کماحقہ' واقفیت حاصل کی اور بڑی تلاش اور تفحص سے مواد فراہم کیا اسلامی مورخین کی صداقت اور سچائی کے متعلق اپنے یقین کو مستحکم کیا اور مستند راویوں کی روایتوں اور تحریروں کو الگ کر لیا۔ اور اس کے بعد کام شروع کیا۔

اپنے عام انداز کے مطابق سیرت النبیؐ میں بھی شبلی نے پہلے تاریخی اور تمدنی منظر پیش کیا ہے اور پھر آں حضرتؐ کی ولادت سے اصل کام شروع کیا ہے اور آغاز سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا مصنف انتہائی وجدانی کیفیت سے گذر رہا ہے۔ اس باب "ظہور قدسی" کی عبارت میں اس درجہ شعریت اور زور قلم پایا جاتا ہے کہ قاری مبہوت سا ہو جاتا ہے۔ اس کی عبارت میں قدیم میلادوں کا سا رنگ نمایاں ہے اور عبارت میں وہی افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔

چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں۔ چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں ہیں۔

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں سال صرف کر دیئے سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔" وغیرہ وغیرہ (سیرۃ النبی صفحہ ۱۷۰)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والا اس جوش عقیدت اور غلو میں ایسی ہی مبالغہ آرائیاں کرتا رہے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہے ہمارا شاعر مزاج اور رنگین قلم مصنف حالات اور واقعات لکھتے وقت حقیقت و درایت سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹتا ہے۔ البتہ ایک عمر کے صبر آزما انتظار کے دوران عبارت کو لکھتے وقت اس کا قلم خوشی سے جھوم اٹھا اور برسوں کا رکا ہوا سیل عقیدت ایک دم رواں ہو گیا۔ اپنے محبوب اور خیر البشر ہمرو کی سوانح عمری لکھتے وقت ہمارے مصنف نے اپنی تحقیق و تلاش کے تمام ذخیرے نثار کر دیئے ہیں۔ اور پہلی جلد دماغ سے اور دوسری دل سے لکھی ہے۔

نقش اول میں مورخ کے قلم کی گلکاری ہے اور نقش ثانی میں جو سراپا پیش کیا ہے۔ اس میں مورخ کے ساتھ عورت کی قلم کاری بھی حاصل ہے۔

افسوس کہ جس کام کو انھوں نے اتنے صبر آزما انتظار کے بعد اتنے ذوق وشوق سے شروع کیا تھا اس کو مکمل نہ کر سکے اور وفات پا گئے اور صرف دو ہی جلدیں مرتب کر سکے۔ لیکن ان دو ہی جلدوں میں وہ اتنا کچھ بتا گئے ہیں کہ ان کے بعد کے سیرت نگار اس پر کوئی خاص اضافہ نہ کر سکے۔ سیرت النبی محض رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے سادہ واقعات پر مشتمل نہیں ہے بلکہ بقول خود یہ۔

"دائرۃ المعارف النبویہ ہے۔"

ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آن حضرتؐ کے سوانح حیات کو جدید رنگ میں پیش کیا ہے آپ کی زندگی کے جن پہلوؤں پر یورپ کے مصنفین نے اور دوسرے غیر مسلم مناظرین نے اعتراضات کر کے شکوک اور شبہات پیدا کر دیئے تھے۔ ان کو منطقی دلائل اور واقعات کے تدریجی بیان سے دور کر دیا ہے۔

خصوصًا اس ضمن میں یہ غلط فہمی جو پھیلائی گئی ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے اس کی مختلف واقعات سے زبردست تردید کی اور ثابت کیا ہے کہ آپ نے زیادہ تر دفاعی جنگیں لڑی ہیں اس بات کو مختلف واقعات سے ثابت کر دیا ہے کہ ایک جری اور کامران سپہ سالار ہونے کے باوجود آپؐ کی پیغمبرانہ شان نمایاں تھی اور آپؐ میدان کارزار میں بھی دعا اور عبادت میں مصروف رہتے۔ آپؐ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل نہیں کیا وغیرہ وغیرہ اس ضمن میں شبلی نے

بڑی ہوشیاری سے کام لیا ہے اور جیسا کہ ایک اچھے سوانح نگار کا فرض ہے کہ واقعات کے انبار میں سے انہی واقعات کو منتخب کرے جو موقع اور محل کے اعتبار سے مناسب ہوں اور ساتھ ہی اظہار مقصد میں زور پیدا کر دے۔ ظاہر ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات سے زیادہ ایک ہی موضوع اور رخ کے بارے میں۔

بکثرت واقعات کہاں ہو سکتے ہیں لیکن شبلی کے ہر عنوان کے ماتحت چند خاص واقعات کا انتخاب کر لیا ہے انکا کہنا ہے کہ " جہاد کے معرکہ میں آپکے ہاتھ میں گو تیغ و سپر اور جسم مبارک پر خود مغفرت ہوتا تھا لیکن اس وقت بھی پیغمبر اور سپہ سالار کا فرق صاف نظر آتا تھا۔ (سیرت النبیؐ)

چنانچہ اس کے ثبوت میں انھوں نے بے شمار واقعات میں سے چند نہایت موزوں اور مستند واقعات بھی چن لئے ہیں۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

" سپاہی شجاعت کے فخر و غرور سے پیشانیوں پر بل ڈالے ہوئے دشمنوں کے مقابلے میں ہوتے لیکن خود سپہ سالار کی پیشانی زمین نیاز پر ہوتی۔ بدر اور خندق خیبر تبوک اور تمام بڑے بڑے معرکوں میں یہی کیفیت تھی۔"

(سیرۃ النبیؐ صفحہ ۲۶۳)

آنحضرتؐ کو رحمتِ عالم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ آپؐ انسانیت سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ کیوں کہ آپؐ خدا

کی طرف سے محبت کا پیغام لائے تھے اور بندوں کو تباہ و برباد کرنا چاہتے تھے خدا انسانوں سے ماں کی طرح محبت کرتا ہے اس سلسلے میں بھی آپؐ کی حیات مبارک میں بے شمار واقعات کا ذخیرہ موجود ہے اس کے انتخاب میں بھی شبلی نے اسی محتاط تکنیک سے کام لیا ہے۔ اور محض چند موثر واقعات ہی پر اکتفا کی ہے مثلاً اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ جب کسی غزوہ میں ایک عورت گرفتار ہو کر آئی اس کا بچہ گم تھا اور وہ جوش محبت میں جس بچے کو دیکھتی اپنے سینہ سے لگاتی اور دودھ پلاتی ایسے موقع پر۔

"آپ نے فرمایا کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچے کو آگ میں ڈال دے لوگوں نے عرض کی "ہرگز نہیں" فرمایا تو خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ محبت ہے۔ جتنی اس کو اپنے بچہ سے ہے۔"

(سیرۃ النبیؐ صفحہ ۱۷۲)

آنحضرتؐ کے اخلاق و شمائل اور منکسر مزاجی کے متعلق خلق عظیم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے آپؐ مجسم اخلاق و عمل تھے اور پھر آپؐ کی ہر ادا کو محفوظ کیا گیا ہے۔ لیکن شبلی اپنے ہیرو کے اخلاق و عادات کے اس ضخیم دفتر میں وہ موقع تلاش کرتے ہیں جہاں آکر بڑی سے بڑی بشری قوت خلاف لغزش میں آجاتی ہے مگر شبلی کا ہیرو زیادہ منکسر اور عظیم ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ چند ہی واقعات کی مثال سے اس کی عظمت کا کامل۔

ترین نمونہ محض اپنی امت ہی کی نظر میں نہیں بلکہ اغیار کے نزدیک بھی تکمیل انسانیت نظر آتا ہے۔ مثلاً۔

"مفتوح شہروں میں داخل ہوتے ہوئے دنیا کے ہر فاتح کا سر غرور و ناز سے بلند ہو جاتا ہے۔ لیکن مکہ و خیبر کا فاتح اس وقت بھی اپنا سر نیاز بارگاہ ایزدی میں جھکا کر شہر میں داخل ہوا۔ ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ فتح مکہ میں جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذی طویٰ پہونچے اور دیکھا کہ خدا نے آپؐ کو فتح کی عزت عطا کی ہے تو آپؐ نے اپنی سواری پر توقف کیا تاکہ اپنا سر خدا کے سامنے جھکا لیں۔" (سیرۃ النبیؐ صفحہ ۱۲۸)

یا یہ کہ باوجود اس کے کہ لوگ آپؐ پر ایمان رکھتے تھے اور آپ کی ہر بات خاموشی سے سنتے تھے۔ آپؐ بے جا طول طویل نصیحتیں نہ فرماتے یا بے جا زجر و توبیخ کے بجائے شفقت کے قائل تھے اس کی چند مثالیں دی ہیں۔ لیکن بے حد موثر۔

"عباد بن سرجیل مدینہ میں ایک صاحب تھے ایک دفعہ قحط پڑا اور بھوک کی حالت میں ایک باغ میں گھس گئے اور خوشے توڑ کر کچھ دامن میں رکھ لئے باغ کے مالک کو معلوم ہوا تو اس نے ان کو مارا اور کپڑے اتروا لئے یہ آنحضرتؐ کے پاس شکایت لیکر آئے مدعا علیہ بھی ساتھ تھا۔ آپؐ نے اس کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ جاہل تھا اس کو

تعلیم دینا تھا یہ بھو کا تھا اس کو کھانا کھلانا تھا یہ کہہ کر کپڑے واپس دلوائے اور ساٹھ صاع غلہ اپنے پاس سے عنایت فرمایا۔

(صفحہ ۲۹۷)

اخلاق و عادات کے بعد شبلی آپ کی خطابت کا ذکر کرتے ہیں اور اس میں کافی تفصیل سے کام لے کر یہ امر قاری کے ذہن نشین کرا دیتے ہیں کہ ان کا ہیرو کلمات جامعہ لے کر مبعوث ہوا تھا اور فصیح ترین عرب تھا اور اس فن میں کمال مہارت رکھتا تھا کوئی معمولی نہیں۔ بلکہ اعلیٰ دماغ شخصیت تھی۔ جس کو اپنے خصائل کے ساتھ اقوال پر بھی پوری پوری قدرت حاصل تھی۔ اس میں آپؐ کے معرکۃ الآرا خطبات کے اقتباسات کے علاوہ بعض جزئیاتی تفصیلات مثلاً خطبہ کے وقت کا لباس یا چہرے کے اتار چڑھاؤ کا ذکر جبۂ مبارک اور ہاتھوں کی جنبش دینے کا انداز بیان کر کے بڑی جان ڈال دیتے ہیں۔ ساتھ ہی کمال جرأت سے ان خطبات پر فنی تنقید بھی کرتے ہیں۔

"آپ نے اس حیثیت سے جو خطبے دیئے ہیں اگرچہ وہ نہایت سادہ ہیں تاہم ان میں بھی بلاغت کا اسلوب موجود ہے"

(صفحہ ۲۴۱)

اگرچہ شبلی کا ایمان ہے کہ آپؐ افضل البشر اور مکمل ترین انسان ہیں اور راہ لغت میں عرفی ہی کے ہمنوا ہیں۔ لیکن اس راہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے باوجود آپؐ کی بشری خصوصیات کا نقشہ

بڑی تفصیل اور جامعیت اور دیانت سے کھینچا ہے اور چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بیان کر کے کمال خوبی و ہوشیاری سے اپنے اس ہیرو کو جس کو وہ۔

"شاہ حرم حکمران عرب فرماں روائے اسلام شاہنشاہ کونین"
(سیرۃ النبیؐ ظہور قدسی)

کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں عام انسانی سطح پر لے آتے ہیں اور وہ ہماری نظروں میں کامل ترین انسان ہونے کے باوجود عام انسانی جذبات کا حامل بھی نظر آتا ہے جو بھوک کی شدت سے نڈھال بھی ہو جاتا ہے۔ اور اس کو غصہ بھی آجاتا ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ خندقیں کھودتے کھودتے بھوک اور محنت کی شدت سے نڈھال ہو کر پیٹ سے پتھر بھی باندھ لیتا ہے۔ غرض ان انسانی جذبات اور ضروریات کی آمیزش سے شبلی نے اپنے جلیل القدر ہیرو کا ایک زندہ اور انسانی مرقع پیش کر دیا ہے۔

مولانا شبلی کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو سوانح نگاری میں مولانا شبلی ایک اہم مقام رکھتے ہیں اگرچہ بہترین سوانح نگاری اور اولیت کا فخر مولانا حالی کو حاصل ہے لیکن ان کے معاصر اور ایک حد تک مقلد مولانا شبلی بھی نہ صرف قابل ذکر ہیں بلکہ بلند پایہ ہیں۔ اور چند وجوہات کی بنا پر بعض باتوں میں مولانا حالی پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ذہنی اعتبار سے مولانا حالی سے بلند ہیں

لیکن حالی کی حقیقت پسندی ان کے حصہ میں نہیں آئی ۔

سوانح و سیرت نگاری کے متعلق شبلی کے نظریات ان کی سوانحی تصنیفات کے سلسلے میں شدہ شدہ بیان کیے جا چکے ہیں۔ تاہم یہاں ان کا دہرا دینا غیر مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ان کے نزدیک ہر اس شخص کی سوانح عمری قابل تحریر ہے جس کی زندگی میں سعی و عمل جد و جہد ہمت و عبرت کی اقدار ملتی ہیں خواہ وہ ایک عالی مرتبت شاہنشاہ ہو اور خواہ ایک ادنیٰ مزدور اس کے علاوہ وہ سوانح نگاری سے قوم کو خصوصاً اور عوام کو عموماً ایک فرد کی زندگی خیالات اور تجربات کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دوسری سوانح عمریاں اتنی پراثر نہیں ہو سکتیں جتنی کہ دوسری تاریخی شخصیتوں کی سوانح عمریاں کارآمد ہوتی ہیں کیونکہ انسان موجود اور قریب تر شخصیتوں کے لئے اتنی عقیدت نہیں رکھتا جتنی کہ اسلاف سے رکھتا ہے یہی وجہ ہے۔ کہ انھوں نے حالی کے برعکس معاصرین کی سوانح عمریوں کو چنداں قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ اور ان تاریخی نمونوں کا انتخاب کیا جن کی عظمت و جلال کا سکہ پہلے ہی سے لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا مامون الرشید، فاروق اعظم، امام اعظم اور غزالی کے نام سنتے ہی لوگ گردنیں جھکا دیتے ہیں اور پھر "سیرت النبیؐ" کا جلیل القدر اور عدیم المثال ہیرو اپنے اور پرائے سب ہی کی نگاہوں میں محترم و معظم رہا ہے۔

موضاعات کے کامیاب انتخاب کے علاوہ ان کو اس امر کا پورا

احساس تھا کہ وہ آرٹ کی تخلیق کر رہے ہیں۔ ان کی اپنی سوانح عمریوں کے لکھنے پر وہی مسرت اور حظ ہوتا تھا جو ایک مصور کو اعلیٰ مرقع بنا کر اور ایک شاعر کو اچھے شعر کی تخلیق کرنے کے بعد ہوتا ہے۔

شبلی فلسفہ اور تاریخ سے طبعی مناسبت رکھتے تھے اور اعلیٰ اور مستند سوانح نگاری کے لیے تحقیق محنت اور ملافنت کے قائل تھے ساتھ ہی علمیت کے اظہار کے بھی دلدادہ تھے۔ وہ اپنے افراد کے سوانح لکھنے سے پہلے ہم کو رسمی تاریخی سیاسی اور تمدنی ماحول میں لے جاتے ہیں جس میں ان کا موضوع سانس لیتا ہے۔ جس کے اثرات کو قبول کرتا ہے اور جس فضا اور ماحول میں ان کے فرد کی شخصیت کی نشوونما ہوتی ہے اور اس حربے سے وہ قاری کو اپنے موضوع سے بہت قریب لے جاتے ہیں اور وہ اس سے ہمدردی محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ فرض وہ بڑی تحقیق اور کاوش سے انجام دیتے ہیں اور اکثر اس سلسلے میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ یہ سیاسی سماجی اور تاریخی پس منظر بعض اوقات اتنا طویل اور نمایاں ہوتا ہے کہ سیرت اور سوانح کے پہلے پس منظر دب جاتے ہیں۔

اس اعتبار سے شبلی کا نظریہ مورخانہ ہے۔ لیکن وہ ایک مورخ کا ذہن نہیں رکھتے اور ان میں وہ بے تعلقی اور بے گانگی نہیں پائی جاتی جو کسی چیز کی صحت کو جانچنے اور روایت اور درایت کا کڑے سے کڑا معیار قائم کرنے کے لئے ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ باوجود اس

کے کہ وہ تاریخ میں منظر اور ماحول پر بڑی توجہ دیتے ہیں۔ لیکن قاری کی توجہ شخصیت کے کردار اور ذات پر مرکوز رہتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ سیرت نگار پہلے ہیں۔ اور مورخ بعد میں۔ ساتھ ہی شبلی کا اسلوب بھی تاریخ سے زیادہ سوانح نگاری کے لئے زیادہ موزوں و مناسب ہے ان کا وہی شاعرانہ اسلوب اور مبالغہ محاورات اور استعارات کا استعمال جو ان کا تاریخ نگاری میں عیب بن جاتا ہے۔ سوانح نگاری میں زندگی اور حسن بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ بہر حال وہ اچھی صلاحیتوں اور اچھی تحریر کے مالک تھے۔ ان کی تحریروں کے متعلق مہدی الافادی نے خوب لکھا ہے۔

"حالی نے مسدس کے ساتھ مقدمہ شعر و شاعری اور حیات جاوید لکھ کر اپنا ٹھکانہ کر لیا۔ لیکن شبلی قطعاً غیر فانی ہیں۔ آج ہزاروں صفحے متعدد جلدوں میں ان کے قلم سے نکل چکے ہیں۔ اور جس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ کسی زبان میں اس سے بہتر مجموعہ خیال نہیں"

(افادات مہدی۔ علامہ شبلی کا ماہوار اردو رسالہ صفحہ ۷۴)

اگرچہ مہدی کا یہ بیان اتنا صحیح نہیں کہ اس سے بہتر مجموعہ خیال نہیں تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے وقت کا عمدہ اور بلند مجموعہ خیال ہے۔

پانچواں باب

عہد سرسید کے دوسرے اہم سوانح نگار

حالی اور شبلی کی سوانح نگاری کا جائزہ لینے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وقت کے تقاضوں میں انقلاب آچکا ہے اور زمانے کی رفتار ایک نئے موڑ کی طرف مڑ گئی ہے

دراصل یہ انقلاب بہت عرصہ پہلے آچکا تھا لیکن اس کا احساس نہ ہو سکا تھا۔ دہلی کالج اور فورٹ ولیم کالج کی علمی اور ادبی خدمات یعنی ان تراجم اور تصنیفات نے جو ان ہر دو اداروں کی زیر نگرانی تیار کرائی گئی تھیں۔ یہ ثابت کر دیا تھا کہ نثر ٹھوس اور خشک علمی مسائل اور موضوعات کی بھی متحمل ہو سکتی ہے۔ اور اس میں وہ گہرائی اور لچک موجود ہے جو دنیا کی زندہ اور زبردست علمی زبانوں کی بقاء کا باعث ہوتی ہے۔ ان ہر دو اداروں خصوصاً دہلی کالج نے ہماری کم مایہ

زبان میں تاریخ جغرافیہ سائنس ریاضیات کے موضوعات پر امید افزا اضافے کئے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے دہلی کالج کو ختم کر کے اردو کی اس چھوٹی سی پونجی کو بھی ختم کر دیا اور وہ تمام ذخیرہ جو ایک مدت کی محنت اور کاوش سے فراہم ہوا تھا نذر آتش کر دیا گیا۔ مولوی ذکاء اللہ کا بیان ہے کہ غضبناک مجمع جس وقت کالج کی چاردیواری میں داخل ہوا اور کالج کا نظام درہم برہم ہو گیا تو انھوں نے الماریوں میں رکھی ہوئی کتابوں کو نظر آتش کر دیا اور وہ کتابیں جو لکڑی کے صندوقوں میں بند رکھی تھیں ان کو بھی صندوقوں سے نکال کر جلا دیا

غرض ایک بار پھر ہماری زبان خالی ہاتھ رہ گئی اس ہنگامہ کے بعد زندگی کا طور اس درجہ بگڑ چکا تھا کہ عرصہ تک زبان کے علمی اور ادبی بننے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لیکن سرسید اسی امید کی کرن کے بھروسے پر اٹھے جو دہلی کالج اور فورٹ ولیم کالج نے دکھائی تھی اور انھوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ سرسید کے پیش نظر زبان کو ترقی دینے کا علمی اور ادبی مقصد نہ تھا بلکہ وہ قوم کی اصلاح اور تعمیر کا مقصد لے کر اٹھے تھے ان کا یہ مقصد جتنا عظیم تھا اتنا ہی مشکل تھا کیونکہ قوم کی حالت ایک ایسی کشتی کی تھی جو بھنور میں پھنسی ہوئی ہو مگر اہل کشتی کو اس امر کا مطلق احساس نہ ہو۔ وہ اپنی سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑ ڈالنا چاہتے تھے۔ اور اس کے لئے زبان و قلم کو انھوں نے اپنا آلۂ کار بنایا ان کے پیش نظر دو اہم مسائل تھے۔ قوم کو فکری

حالات سے آگاہ کرنا اور اس کو وقت کے تقاضے پورے کرنے کے قابل بنایا۔ اسی طرح ان کے منصوبے کے دو راستے تھے مذہبی اور سیاسی۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ مذہب پر عبور حاصل کر کے ہر چیز کو مذہب کے معیار پہ پیش کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ قوم ان کی ہر بات کو بخوشی ماننے پر تیار ہو جائے اور دوسری طرف وہ انگریزوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لا کر ہر دو فریق میں مفاہمت پیدا کر دینا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مغرب کے افکار کو زیادہ سے زیادہ متعارف کرانے کی کوشش کی۔ اور جلد ہی مسلمان خصوصاً اہل قلم حضرات مغرب کے رجحانات سے متاثر ہوئے اور ان کے دلدادہ ... ہونے لگے۔ اس طرح لکھنے والوں کا اندازِ فکر بدلتا گیا وہ عقلیت اور درایت (Rationalism) کی طرف بڑھتے گئے۔

یہ بڑی کش مکش کا زمانہ تھا اور اس دور میں قدیم و جدید مشرق و مغرب کے علاوہ فرقوں کی اندرونی اور بیرونی آویزش اور باہم مناقشات کا زور تھا۔ اور یہ افکار و ابتلا کا وہ زمانہ تھا جس میں عظیم آرٹ کی تخلیق ہوتی ہے۔ ہم اس صدی کو اصلاح استدلال اور مناظرے کی صدی کہہ سکتے ہیں۔ اس دور میں ہر قسم کے ادب کی تخلیق اپنی پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر کی جا رہی تھی۔ اور یہی اس وقت کے اعلیٰ ادبی معیار تھے۔ چنانچہ سوانح نگاری کو بھی انہی مقاصد کے لئے آلۂ کار بنایا گیا۔ سر سید کے "خطبات احمدیہ" کا جو انھوں نے آن حضرت صلعم

کے یوربین سوانح نگاروں کے متعصبانہ الزامات اور اعتراضات
کے جواب میں بڑی تحقیق اور تلاش کے بعد لکھی تھی۔ منظر عام پر آنا تھا
کہ رسول کریمؐ کی سوانح عمریاں اسی نہج پر لکھنے کا رواج نکل آیا۔ جن میں
مرزا حیرت دہلوی فیروز سنز کوی۔ مولانا شبلی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں
آن حضرتؐ کے علاوہ دوسرے بزرگوں بادشاہوں اور قابل ذکر
لوگوں کی بھی۔ مناظرانہ سوانح عمریاں تحریر کی گئیں۔

ان مناظرانہ سوانح عمریوں کے علاوہ سوانح عمری کو دوسرے
اصلاحی مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا۔ مولانا حالی اور ان کے بعد
شبلی نے اپنی تصنیفات اور موضوعات کے انتخابات کے ذریعہ
اس فن کے راستے صاف کر ہی دیئے تھے اور اس طرح عہد سرسید کے
دوسرے سوانح نگاروں کو اس راستے پر چلنے میں کوئی دقت نہ تھی
یہی وجہ ہے کہ ہم کو اس دور میں سوانحی تصانیف کا طویل سلسلہ ملتا ہے۔

اول تو یہ دور تھا بھی تاریخ و تذکرے کا دوسرے اہل قلم حضرات
جن کے قلم ہمیشہ نئے اور اچھوتے میدانوں کے متلاشی رہتے ہیں۔ اس
نئے میدان کی وسعتوں کو دیکھ کر اس میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ اور
اس نئے اور دلچسپ فن کے انوکھے پہلوؤں سے لطف اندوز ہونے لگے

برٹش میوزیم کی کیٹلاگ مرتبہ بلوم ہارٹ اور مرزا سجاد بیگ
کی الفہرست کے متعدد صفحات سیرت نگاروں اور تذکرہ نویسوں
اور ان کی تصانیف سے بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن اس طولانی سلسلہ

یں چند نام ہی قابل ذکر ہیں۔ جن کی کوششوں کو اچھی اور کامیاب کوششیں کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ عہد سرسید کے یہ چند نام قابل ذکر ہیں مرزا حیرت دہلوی، احمد حسن خان۔ مولوی احمد دین احمد حسین الہ آبادی مولوی ذکار اللہ۔ فیروز الدین ڈسکوی۔ سراج الدین احمد ایڈیٹر چودھویں صدی۔ عبدالحلیم شرر۔ منشی محمد الدین فوق، خواجہ غلام الثقلین، نذیر احمد قاضی سلیمان اور عبدالرزاق کانپوری

مذکورہ بالا مصنفین میں سے بعض کی تصانیف کا سلسلہ خاصہ لمبا ہے۔ اور بعض نے ایک یا دو ہی کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن اس میں انھوں نے ایسی فنی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے کہ اس مقالہ میں ان کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ باوجود انتہائی تلاش کے کئی مصنفین کی کتابیں مجھے نہ مل سکیں اور اس سبب سے ان کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہ کی جا سکی۔ تاہم ان کے موضوعات کے انتخاب سے ان کی سوانح نگاری کی نوعیت ضرور معلوم ہو جاتی ہے

ان میں سے ایک قابل ذکر نام احمد حسین الہ آبادی کا ہے یہ۔

(۱) حیات سعدی (۲) حیات نورالدین محمود (۳) حیات ذوق۔ (۴) اور حیات سلطان صلاح الدین کے مصنف ہیں۔ ان کے موضوعات کے انتخاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص طبقہ یا سلسلہ کے موضوعات کو ہی سوانح نگاری کے لئے مستحق انتخاب نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ وہ قومی ہیروؤں بادشاہوں۔ شعراء اور عالموں کے سوانح حیات کو یکساں

طور پر قابل توجہ سمجھتے تھے۔ اور انھوں نے جہاں سلطان صلاح الدین جیسے قومی ہیرو کی سوانح عمری کو قابل ذکر سمجھا وہاں استاذ ذوق کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ بہرصورت ان کے تمام انداز تصنیف پر غائر نظر ڈالتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اعلیٰ سوانح نگاری کے فن سے تقریباً بے خبر تھے۔ البتہ ان کے خاکے بہت حد تک گوارہ کئے جا سکتے ہیں اور ان کی تمام تر توجہ بھی اس پر صرف ہوئی۔

مرزا حیرت دہلوی اڈیٹر اخبار اودھ لکھنو اس دور کے ایک اور مصنف ہیں انھوں نے کثرت سے کتابیں لکھی ہیں اور ان کی تصانیف کی بھی۔ خاصی تعداد ہے ان کی سوانحی تصانیف جو دستیاب ہو سکی ہیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) حیات طیبہ (۲) حیات فردوسی۔ (۳) سیرۃ محمدیہ حیات طیبہ شاہ اسمٰعیل شہید کی سوانح عمری ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۳۱۲ھ ہجری قدسی ہے نواب سعید الدین احمد خاں صاحب طالب۔ جاگیردار ریاست لہارو نے قطعہ تاریخ کہا ہے۔

جب ہوا سرشار فکر صہبا ہے میں   یہ ندا ہاتف کی آئی نسخہ بے مثل ہے
(سنہ ۱۳۱۲ ہجری قدسی ام)

کتاب تین اہم حصوں میں منقسم ہے۔ دیباچہ پہلا حصہ دوسرا حصہ اس کتاب میں مرزا صاحب شبلی کے طرز تصنیف سے متاثر ہوتے ہیں اور جس طرح مولانا شبلی سوانح نگاری کے ضمن میں تاریخی

اور سماجی پس منظر کو ہیرو کے کردار شخصیت کے ذہنی اور علمی ارتقاء کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ مرزا صاحب بھی تاریخی اور سماجی پس منظر کو اس ضمن میں ضروری جانتے تھے۔ اور انھوں نے شاہ صاحب کے حالات زندگی اور کارناموں کا ذکر کرنے سے پیشتر عام اسلامی ممالک کے اس زوال اور انحطاط کا مختصر اور جامع خاکہ پیش کیا ہے۔ جس میں ان کے ہیرو نے آنکھ کھولی۔ پھر ہندوستان کی درباری اور عوامی زندگی کا تاریخی اور سماجی پس منظر پیش کیا ہے۔ معاشرے اور سلطنت کی انحطاط پذیری لوگوں کی ضعیف الاعتقادی اور مذہبی بدعتوں کا ذکر ذرا تفصیل سے کیا ہے۔ اور یہ ہی وہ پہلو ہیں جو شاہ صاحب کے پیش نظر تھے اور جن کی اصلاح کا مقصد لے کر وہ اٹھے تھے۔ غرض مرزا حیرت عہد عالمگیر سے لے کر آخری مغلیہ تاجدار تک کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور خاص اپنے موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

مرزا صاحب کو سوانح نگاری کا خاصہ سلیقہ ہے۔ وہ اپنے موضوع کو محض ایک مصلح قوم مجاہد اور شہید ہی کی حیثیت سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کے انسانی مشاغل اور خصائل پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اور ان کو اس امر کا احساس ہے کہ کسی شخصیت کی تعمیر میں اس کے گھریلو ماحول عادات اور نجی مشاغل کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے کتاب کے پہلے اور دوسرے باب میں مولانا اسمٰعیل شہید کے بچپن کے حالات تعلیم اور تربیت کے علاوہ لڑکپن اور جوانی کے رجحانات

اور مشاغل کا بھی ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ جہاں شاہ صاحب دماغی اور روحانی تربیت اور نشوونما پاتے رہے تھے۔ وہاں ان کو اپنی جسمانی صحت اور تربیت کا بھی خیال تھا۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ یہ مولویوں اور خشک زاہدوں کے خاندان سے تعلق رکھنے والا مصلح اور مجاہد عام انسانی زندگی سے قریب تھا اور اس میں دلچسپ جزئیات کو بڑی اچھی طرح شامل کیا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کو شہزادوں کی تیراکی اور فنونِ حرب سے گہری دلچسپی اور واقفیت تھی۔ ان کی فطرت تھی۔ ان کی فطرت اور رجحانات کا یہی رخ ان کی آئندہ زندگی پر اثر انداز ہوا ہے۔

اس کے بعد کے ابواب میں عوام الناس کی شورشیں مولانا کا پہلا وعظ گورنمنٹ کی انصاف پسندی سرکار برطانیہ کی طرف سے ممانعت وعظ اور مولانا کی رزیڈنٹ سے ملاقات مولانا کا سفر پنجاب سکھوں اور مسلمانوں کے اخلاق ملکی برتاؤ مولانا شہید کی کامیابیاں خلاف شرع امور کی اصلاح پنجاب سے واپسی دہلی کی افواہیں مولانا سید احمد بریلوی سے ملاقات جہاد کی تدبیر فتح پشاور اور پھر شہادت کا حال ہے۔ ان کی تصانیف کا ذکر کرنے کے علاوہ بعض خطوط بھی پیش کئے ہیں۔

دوسرا حصہ مولوی سید احمد بریلوی کے حالات پر مشتمل ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے یک وقت دو کام لینا تھے۔ اول تو یہ

کہ حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید ایک ہی تحریک سے وابستہ اور ہمخیال رہے تھے۔ اس لئے ان کے حالات زندگی پیش کر کے مولانا شہید کی سیرت و تحریک پر مزید روشنی ڈالنا مقصود تھا دوسرے عقیدت اور فرض نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ ان بزرگوں کی سیرت نگاری سے بھی عہدہ برآ ہوتے چلیں

مرزا صاحب طرزِ تصنیف میں نہ صرف مولانا شبلی سے متاثر ہیں بلکہ مولانا حالی سے بھی متاثر ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف اور تدوین میں ان کے پیش نظر حیات جاوید بھی تھی۔

عہد سرسید کے ان سوانح نگاروں میں ایک بات اور بھی قابل ذکر نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے ہیرو کی قدر افزائی یورپین مورخین اور مصنفین کی آرا اور حوالوں کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مرزا حیرت نے بھی اپنی تصنیف کو مکمل اور وقیع بنانے کے لئے یورپین مورخین کی آرا بھی درج کی ہیں۔

مرزا حیرت اپنے دور کے مناظرانہ رجحانات سے بے حد متاثر ہیں لب ولہجہ پر شدت عقیدت اور جذبہ کا عیب ہے اپنے دور کے اصلاحی مقاصد کے پیش نظر اپنی رائے اور نظریات کو بھی شامل کرتے جاتے ہیں۔

حیات فردوسی حیات فردوسی ان کی دوسری تصنیف ہے

یہ ایک خاکہ ہے جو پیسہ اخبار لاہور نے ۱۹۰۲ء میں شائع کیا۔
اس کا مقدمہ نفس مضمون سے غیر متعلق ہے
۲۲ صفحوں میں نظم پر خیال آرائی کی ہے تمہید سے لے کر آخری سطور میں بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا جس سے یہ واضح ہو کہ یہ مقدمہ حیات فردوسی سے تعلق رکھتا ہے۔

مرزا صاحب کا یہ مقدمہ مولانا حالی کے شعر و شاعری کا ردِ عمل معلوم ہوتا ہے۔ وہی لب و لہجہ وہی انداز اختیار کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مقدمہ شعر و شاعری کا چربہ اتارا ہے۔ انگریزی الفاظ کا استعمال مثلاً لٹریچر ایٹ ماسٹر پورک ریمارک کا بکثرت استعمال اور جس طرح مولانا حالی نے متعدد بار ملٹن کی مثال دی ہے۔ اسی طرح ہر جگہ شیکسپیئر کی مثال اور مقولے پیش کئے ہیں۔ غرض مجموعی طرز تحریر مولانا حالی کے اثر کی غمازی کر رہا ہے۔ لیکن انھوں نے یہ مقدمہ شاید محض مولانا حالی ہی کی کاٹ کرنے کو لکھا تھا۔ اور جا بجا ان کی نیت پر حملے کئے ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

موجودہ ترقی کناں زمانے میں جبکہ مغربی تعلیم کے نئے سیلاب نے تمام ہندوستان کو ہڑپ کر لیا ہے چند ناخواندہ اور علوم مشرقی سے محض نابلد جنھوں نے کسی قدر انگریزی پڑھی یا انگریزی خوانوں کی صحبت میں بیٹھے ہیں۔ انھوں نے جوں ہی علوم مغربی کے روشن آفتاب کو دیکھا ان کی نگاہیں

ایسی چکا چوند ہوئیں کہ پھر انھیں کچھ نہ سوجھا اور کمبخت بیچاری مشرقی شاعری اور علوم پر اندھا دھند گر پڑے اور خدا واسطے کی بے چارے متقدمین پر لعن طعن شروع کر دی۔

اتنا لکھ کر بھی مرزا حیرت کا دل نہیں بھرا آگے چل کر لکھتے ہیں "بعض نا فہم اور موجودہ زمانے کے کم عقل شعراء نے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے وہ وہ ہرزہ سرائی مشرقی شعراء کی نسبت کی ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے ان کی یہ تحریریں دیکھ کر شرم آتی ہے کہ جن لوگوں کو خوش کرنے کے لئے وہ ایسی بے معنی تحریریں لکھتے ہیں الٹا ان کا ہی دل دکھتا ہے اور وہ سخت حقارت کی نظر سے ایسے شخص کو دیکھتے ہیں کہ جس کی یہ بے ہودہ رائے ہو۔"

(حیات فردوسی دیباچہ)

مندرجہ بالا اقتباسات اگرچہ بے تعلق سے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان سے اس زمانے کے مصنفین کے رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی متصدیت کو کس طرح دوسروں پر ٹھونسنے کے قائل تھے اور جہاں کہیں بھی موقع ملتا تھا وہ قاری کو اپنا ہم خیال بنانے میں کسر اٹھا نہ رکھتے تھے اس مقدمہ کے بعد نفس مضمون یا اصل موضوع پر آتے ہیں۔ صرف چھیاسٹھ صفحوں میں فردوسی کا حال ہے باقی میں اس کے کلام پر تنقید اور

مغربی و مشرقی لوگوں کی آراء دی ہیں اور چھیاسٹھ صفحے سوائے چند کے سب کے سب ہی مناقشہ پر مشتمل ہیں دراصل یہی فردوسی کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے جو اس کی سیرت کردار اور رتبہ پر روشنی ڈالتا ہے۔ مرزا حیرت نے اس واقعہ کو بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس میں جانب داری اور رواداری سے مطلق کام نہیں لیا۔ جو واقعات ان کو ہملٹن اور دوسرے چند ذرائع سے ملے ہیں ان کو بیان کیا ہے۔ اگرچہ یہ وہی بارہا کا سنا اور دہرایا ہوا واقعہ ہے جس کا لب لباب یہ بتایا جاتا ہے کہ محمود غزنوی نے فردوسی سے شاہنامہ لکھنے کی فرمائش کی اور ساٹھ ہزار اشرفیاں دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن جب کام ہوگیا۔ تو اس نے زر موعود دینے کے لئے انکار کیا اور بے چارہ شاعر عسرت و تنگ دستی کے دن گذارتا رہا۔ اور اسی حال میں مرگیا۔

اس مناقشہ اور واقعے کو مرزا حیرت نے اس خاکہ کا بنیادی نقطہ بنایا اور اس کو ایسے انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ مسرت بخش اور فائدہ مند محسوس ہونے لگا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیلات کو انھوں نے بڑے ڈرامائی انداز میں بتدریج پیش کیا ہے۔ فردوسی کا محمود کے بارے میں پہنچنا وہاں اس کی قدر و منزلت اور محمود کی حد سے زیادہ مہربانی پھر دربار غزالی کے بعض شرپسند عناصر کی مفسدہ پرور بے اعتدالیاں اس پیرائے میں بیان کی ہیں۔ کہ ہم آہستہ آہستہ نتیجہ کی طرف پہنچتے ہیں اور شروع سے آخر تک اس سب کو اتفاقات

اور حادثات پر محمول کرتے جاتے ہیں۔

عام طور پر سوانح نگار صاحب سوانح کی ہمدردی میں واقعات اگرچہ صحیح بیان کرتا ہے۔ لیکن اس پیرائے میں کہ قاری کی تمام تر ہمدردیاں سمٹ کر صاحب سوانح کی طرف مرکوز ہو جاتی ہیں اور وہ اس کے حریف اور مخالف کو مورد الزام سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن مرزا حیرت نے یہ چیز پیدا نہیں ہونے دی وہ ایک طرف تو اپنے ہیرو کی قابلیت اور مرتبہ کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور اس واقعہ کے نتائج کا جہاں تک تعلق ہے وہاں تک ان کو اپنے ہیرو سے دلی ہمدردی بھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس کی بعض نادرستیوں اور کمزوریوں کو بھی چھپانے کی کوشش نہیں کرتے جو ان کے نزدیک اس نتیجہ کا باعث بنیں۔ ان کے بیان سے ان کا ہیرو غزنی کے سلطان کے بے جا ظلم و ستم کا شکار اور عسرت و تنگ دستی میں مرنے والا بوڑھا نہیں رہ جاتا بلکہ اب بھی ایک بلند پایہ شاعر ہے جس کی محمود کے دربار کے علاوہ اور درباروں میں بھی قدر و قیمت تھی ساتھ ہی وہ ایک جلد باز مردم ناشناس اور کسی حد تک احسان فراموش بھی معلوم ہوتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو بلحاظ فن مرزا حیرت کا لکھا ہوا یہ (SKetch) خاکہ مکمل ہے۔ دراصل سوانح نگاری کی یہ صنف بہت زیادہ تشفی بخش نہیں ہوتی اور نہ اس میں مکمل سوانح حیات کے مواد کو پیش کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس میں تو چند اہم واقعات اور ایسی تفصیلات درج ہوتی ہیں جو اس کے کردار پر روشنی

ڈال سکیں۔ دراصل خاکہ نویس کا مقصد تذکرہ نویسی سے کچھ زیادہ تفصیلات کا نکلمند کرنا ہوتا ہے جس کے ذریعہ ہم موضوع کے کارناموں اور محاسن اور خصائل سے بخوبی آشنا ہو جاتے ہیں۔

حیات فردوسی میں یہی بات موجود ہے۔ اس کے ابتدائی حالات بہت مختصر ہیں صرف اسی واقعہ پر زور دیا ہے۔ جس کے گرد فردوسی کی تمام زندگی گھوم رہی ہے اور اگر وہ مفصل حالات کے طور پر فردوسی کے عادات واطوار پر روشنی ڈالنا چاہتے تو شاید اس خوبی اور بے تعلقی سے نہ ڈال سکتے۔ جس طرح اس واقعہ کے ضمن میں اس کی شخصیت خود بخود ہمارے سامنے آگئی ہے۔

اگرچہ بلحاظ صنف اور نوعیت بھی مرزا صاحب کی حیات فردوسی کا مقابلہ مولانا حالی کی حیات سعدی سے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ حیات سعدی سے "ایک پہلو مولانا کی نیک اور روادار فطرت کی وجہ سے کمزور رہ گیا ہے کہ بعض اہم اور ضروری معاملات پر انھوں نے روشنی ڈالنا محض اس لئے مناسب نہیں سمجھا کہ ایسا نہ ہو کہ ان کا پسندیدہ "ہیرو" ایک گروہ کا مقبول اور دوسرے گروہ کا مردود ہو جائے۔

مرزا حیرت کو اس کی پرواہ نہیں تھی انھوں نے فردوسی کے مذہب اور عقیدے کے متعلق جو کچھ ان کے علم میں تھا صاف الفاظ میں لکھ دیا۔ اور اس طرح اپنے ہیرو کی پردہ پوشی کی ضرورت نہیں سمجھی اور در اصل

بات بھی یہی ہے جب انسان کسی موضوع پر قلم اٹھائے تو اس کے لئے اظہار جرأت ہونا لازمی ہے بقول ڈاکٹر جانسن When it is painful to tell the truth the story must not be told۔

سیرت محمدیہ — مرزا حیرت کی ایک اور تصنیف ہے اور یہ اس خاص مناظرانہ رجحان کی آئینہ دار ہے جو عہد سر سید کا امتیازی نشان تھا۔ دیباچہ ہی میں اس کتاب کی تصنیف کی غرض و غایت بتادی ہے۔ کہ یورپ کے مورخ اور مستشرقین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام پر بے بنیاد الزامات عائد کرتے ہیں۔ اور اسلام کے اس طرح آناً فاناً میں پھیل جانے۔ کو تلوار کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ارادہ کر لیا کہ ان بے جا الزامات کا جواب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات اقدس سے عموماً اور ان واقعات سے خصوصاً جن سے یہود و نصاریٰ باوجود انتہائی اختلاف کے بھی انکار نہیں کر سکتے۔ دیں گے۔ اور اس کے لئے انھوں نے اپنے دور کے دوسرے لکھنے والوں کی تقلید میں مناقب سے صداقت کی طرف قدم بڑھایا ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت ، زندگی کی سچی صفات کے ذریعہ ظاہر کی ہے اور آنحضرتؐ کی سیرت و سوانح کو تاریخ کی روشنی میں جانچا اور پرکھا ہے۔

دیباچہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔:

"اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ ہم اپنے سچے نجات دھندہ کی

آنحضورؐ کی تعریف کے ورد کو بالائے طاق رکھیں اور اس کی سچی تاریخی صفات سے بحث کر کے جبراً اس کی حقیقت عالم پر ثابت کر دیں۔
دلیلیں ایسی روشن ہوں کہ مانیں اور پھر مانیں اس نظر سے میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح عمری موجودہ زمانے کے مطابق تحریر کرنے کی کوشش کر کے وہ واقعات بہم پہنچائے ہیں۔ کہ متعصب سے متعصب شخص کو بھی قبول کرنے میں چارا نہ ہو۔

(دیباچہ سیرت محمدیہ)

اس اقتباس سے دو نتائج برآمد ہوئے اول تو یہ کہ سیرت و سوانح پر تاریخی روشنی ڈالی ہے۔ دوم یہ کہ مقصد بحث و مناظرہ ہے۔ جس میں دلائل اور شواہد سے کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بات صاف ہو جاتی ہے کہ اب ہماری زبان میں مغرب کے تصور سوانح نگاری کو باقاعدہ جگہ دے دی گئی ہے۔ حالی اور رفقائے سرسید سے وہ لوگ بھی متاثر ہوئے جو اس گروہ کے حلقۂ اثر سے باہر یا مخالف تھے۔

مرزا صاحب نے سیرت محمدیہ وسیع مطالعہ اور گہرے استدلال سے کام لے کر لکھی ہے اور یہ عہد سرسید کا طفیل ہے۔ جن کے طرز فکر سے استفادہ کرنے کا اعتراف مرزا صاحب خود کرتے ہیں۔
" اس کے بعد میں اپنے فخر قوم سید امیر علی صاحب جج ہائی کورٹ

کلکتہ کا انتہا درجہ کا مشکور ہوں جن کی بیش بہا کتاب "اسپرٹ آف اسلام" نے مجھے اس نادر الوجود کتاب کی ترتیب میں بہت مدد دی۔ میں نے اپنے بابوں کی ترتیب میں اس کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور بہت سے مضامین اسی بیش بہا صحیفہ سے اخذ کئے ہیں۔ پھر میں ڈاکٹر سر سید احمد رلیفارمر قوم کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی بیش قیمت کتاب خطبات احمدیہ انا جیل کی تحقیق و تفتیش میں مجھے مدد پہونچائی۔

(دیباچہ سیرت محمدیہ)

انھوں نے عیسائی اور مغربی مستشرقین کی جواب دہی کے علاوہ امیر علی صاحب کی "سپرٹ آف اسلام" سے بھی بعض مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ مثلاً مسئلہ خلافت عثمان اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق پیدا کردہ غلط فہمیوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور ان کا ازالہ بڑے مدلل انداز میں کیا ہے۔ اس کو قاعدہ سوانح حیات کہنا زیادہ درست نہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں نہ صرف آں حضرت صلعم کی سوانح عمری اور تاریخی شواہد سے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ بلکہ تمام عالم اسلام کے تاریخی حالات کا جائزہ اعتراضات کی روشنی میں لے کر ترتیب وار جوابات دیتے ہیں۔ اور اس طرح خالصتاً سوانح نگاری کے نقطۂ نظر سے یہ سوانح عمری کسی قدر ہلکی ہوتی ہے۔

نورتن اکبری مع سوانح اکبر یہ اکبر اعظم اس کے درباریوں

کے مختصر خاکے ہیں اور اس میں بھی خاکہ نویسی کے فرائض کو اچھی طرح ادا کیا گیا ہے۔ مثلاً اکبر کے مختصر حالات کے علاوہ اس کا حلیہ تفریحی مشاغل مذہب لیاقت اور پالیسی کا بھی مختصر اور جامع ذکر کیا ہے اور اس میں بھی اکبر کی زندگی کے اس دلچسپ اور انوکھے واقعہ پر زیادہ زور دیا ہے۔ جس کو دین الٰہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح اکبر کی ذہنیت مزاج اور مذہبی خیالات کا بھوت جو اس کے سر پر سوار تھا تاریخی پر بتدریج ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس مذہب کے جھگڑے میں انھوں نے ذاتی رائے اور جانب داری کو بھی شامل کر دیا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:۔

"اگر غور سے نظر اکبر پہ ڈالی جاوے گی تو معلوم ہو گا کہ اکبر کو چند ملّانوں نے بدنام کر دیا تھا۔ اور یہ اتہام کہ اکبر سجدہ کراتا ہے۔ یہ بھی ملّانوں کی شرارت تھی۔ مشرقی اور مغربی شاہوں کا یہ پرانا قاعدہ تھا کہ جب کوئی دربار میں داخل ہو تو وہ تین بار سجدہ نما سلام کرے اور اس سے واقعی مذہب کو کچھ علاقہ نہیں"

(نورتن اکبری)

اسی طرح ایک جگہ اس کے اس فعل کی تائید یوں کرتے ہیں "اس قسم کے ادب آداب سلطنت کے رعب و دبدبے کے لئے ضروری کا ہوتے ہیں۔" (صفحہ ۹ نورتن اکبری)

اکبر کے علاوہ اکبر کی رانیوں اور بیگموں کے خاکے بھی پیش کئے ہیں اور اس میں خاکہ نویسی کے آداب کو ملحوظ رکھا ہے۔ جودھابائی کی راجپوت نسل اور مذہب کا اس کی عادات اور طریقوں پر اثر ہے اس پر اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔ اور اس مختصر سے خاکے سے اچھی طرح محسوس ہو جاتا ہے کہ اس بیگم کی زندگی اور طور و طریق پر اس کے نسلی امتیازات کس حد تک اثر انداز تھے۔

مریم زمانی کا خاکہ افسانوی انداز میں پیش کیا ہے اور بعض۔ بعض جگہ مکالموں سے ناول کا انداز بھی آگیا ہے۔ واقعے کی نوعیت کچھ ہو لیکن اس میں مرزا حیرت نے ہیروئن کے مخصوص مذہبی کردار کو ہی اس کے پورے خاکے کی بنیاد بنا دیا ہے اور اس کی ان تمام کوششوں کا ذکر جو اس نے اکبر کو عیسائی بنانے اور دربار مغلیہ میں عیسائیت کا پرچار کرنے میں کی تھیں بڑے مبالغہ سے بیان کیا ہے۔

بیگمات کے تذکرے کے بعد ان لوگوں کا ذکر ہے۔ جن کو نورتن اکبری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی بنیادی خصوصیات اور شخصیت کے مخصوص پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ شیخ مبارک اور اس کے مایۂ ناز فرزندان ابوالفضل اور فیضی کی علمی قابلیت اور شخصیت کے ساتھ ان کی لامذہبیت اور مذہب میں بدعت طرازیوں کا ذکر بڑے دلچسپ پیرائے میں کرتے ہیں۔

مرزا حیرت کی زیر نظر کتابوں کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک تیز و تند مزاج مناظر اور اچھے خاکے نویس ہیں جنھوں نے شبلی وحالی سے متاثر ہونے کے باوجود اپنے مخصوص رنگ طبیعت کو بھی برقرار رکھا ہے۔ مرزا

مرزا حیرت دہلوی کے بعد ایک اور قابل ذکر نام "فیروزالدین ڈسکوی کا ہے۔ فیروزالدین ڈسکوی نے موضوع سوانح پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ مجھے ان کی صرف ایک کتاب مل سکی ہے۔

سیرت النبی (پیارے نبی کے پیارے حالات) سنہ طباعت ۱۹۲۳ء

اس کتاب کی غایت تصنیف فیروز صاحب یہ بتاتے ہیں کہ اس کا پہلا مقصد تو یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح مبارک اور اسلام کی صداقت کو بالتفصیل بیان کریں چنانچہ اس کا اظہار انھوں نے اپنے دیباچے کی ان سطور ہی میں کیا ہے۔

"زندگی مستعار کا کچھ پتہ نہیں بہتر ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی کے مختصر حالات اور مقدس واقعات مختصر طور پر لکھ دوں تاکہ ساری دنیا کو معلوم ہو جائے کہ حضور علیہ السلام کی سیرت ہی آپؐ کی صداقت کا اعلیٰ ثبوت ہے۔"

(دیباچہ سیرت النبیؐ)

دوسرا مقصد اس کتاب کی تصنیف سے یہ تھا کہ وہ لوگ جو

قرآن شریف کا ترجمہ کسی استاد کی مدد کے بغیر پڑھتے ہیں۔ وہ مختلف آیات کا موقع اور سبب نزول معلوم نہیں کر سکتے نہ ہی اس بات کا امتیاز کر پاتے ہیں کہ کون سا واقعہ مکہ میں گزرا اور کون سا مدینہ میں اس کے لئے ضروری تھا کہ کوئی ایسی سیرت نبوی موجود ہوتی جس کے ذریعہ خاص خاص واقعات اور آیات کے تعلق اور رابطہ کا پتہ لگایا جا سکے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیروز صاحب کا مقصد اس تصنیف سے ایک تو یہ تھا کہ اس سوانح عمری کے ذریعہ رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ کا مقصد قارئین پر واضح کیا جائے۔ دوسرے آیات کے نزول اور واقعات کا تاریخی رابطہ اور تسلسل معلوم ہو سکے اور اس طرح موصوف نے اس کو خالصتہً سوانح عمری کے نقطۂ نظر سے تصنیف نہیں کیا تھا۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی ثابت کرنا چاہتے تھے کہ آن حضرت نبی آخر الزماںؐ مامور من اللہ اور موید من اللہ تھے اپنے دعووں کی تائید میں دوسری آسمانی کتب اور صحیفوں کی آیات کو بھی پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی انبیاء علیہم السلام کے اقوال بشارت بھی درج کئے ہیں۔ اور اسی طرح ان اعتراضات کی تردید اور جواب دہی کی ہے جو رسول اکرمؐ اور مذہب اسلام پر مخالفین نے کئے ہیں چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"بشارات وہ تحریریں کی گئی ہیں جو آن حضرت پر بلا تکلف صادق آتی ہے اور مومن کا ایمان بڑھاتی ہیں جیسے"

کو راہ دکھاتی ہیں۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کا بعض بشارات کے متعلق جو جھگڑا ہے اس کا بھی فیصلہ ہو گیا۔"

(دیباچہ سیرت النبیؐ)

ان مقاصد کے پیش نظر کتاب کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) انبیاء کے مختصر حالات (۲) خود نبی کریمؐ کے حالات زندگی (۳) آپؐ کے اخلاق و عادات ..... (۴) تورات و انجیل کی بشارات کا ذکر (۵) معجزات اور آیات بینات (۶) آپؐ کی تعلیمات (۷) آپؐ کی حیات مقدسہ کے مقاصد

اس کتاب میں تذکرہ نگاری۔ سیرت اور تاریخ سے مدد لی گئی ہے اختصار اور اجمال کو حد درجہ ملحوظ رکھا ہے۔ وہ تمام تاریخی واقعات یعنی ہجرت، غزوات اور جنگیں جن کو آپؐ کی سیرت و سوانح میں زبردست اہمیت ہے اختصار سے بیان کر دیئے ہیں اور جیسا کہ انھوں نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"اس کتاب میں لمبی چوڑی عبارت آرائی نہیں کی گئی بلکہ سادہ اور صاف طور پر حضور علیہ السلام کے واقعات وغیرہ بیان کر دیئے گئے ہیں۔"

اور یہ حقیقت ہے کہ مصنف نے سادگی اور اختصار کو حد درجہ ملحوظ رکھا ہے۔ عبارت آرائی اور حاشیہ آرائی کا شوق

نہیں معلوم ہوتا۔ اگرچہ کتاب کا مقصد مناظرانہ ہے۔ ہم اس کو مدافعانہ سوانح عمری کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مصنف نے اس تیز مناظرانہ لب و لہجہ سے گریز کیا ہے۔ جو عام مذہبی مناظروں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ خالصتہً سوانح عمری نہیں کہی جا سکتی بلکہ ایک مقصد اور نصب العین کے لئے سوانح حیات کو استعمال کیا گیا ہے۔

سیرت النبیؐ کے علاوہ فیروز ڈسکوی کی تصنیفات میں نوبت اعظم۔ تاریخ محمدی۔ یادگار سعدی۔ یادگار وکٹوریہ تذکرہ شعرائے اردو بھی ہیں اور اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ موصوف نے فن سوانح نگاری کی مختلف اصناف یعنی مناقب۔ سیرت۔ یادگار اور تذکرہ نویسی پر قلم اٹھایا تھا۔

اس عہد کے ایک اور قابل ذکر مصنف منشی محمد الدین فوق ہیں انھوں نے بھی اس فن پر متعدد تصانیف لکھی ہیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

(۱) ابوالحسن ملا دو پیازہ (۲) مہاراجہ رنجیت سنگھ۔ (۳) کشمیر کی رانیاں (۴) یادر فتگاں (۵) غنی کاشمیری۔ (۶) اللہ عارفہ (۷) تذکرہ نوابین دکن (۸) ملا عبدالحکیم سیالکوٹی (۹) نور جہاں اور جہانگیر کی سوانح عمریاں۔

ان کی تصانیف میں سے بھی چند ہی کتابیں دستیاب ہو سکی ہیں جن کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔

للہ عارفہ

ایک مختصر تذکرہ ہے یہ کشمیر کی ایک خدا رسیدہ خاتون کا ذکر ہے۔ جو فقر و سلوک کے لحاظ سے خاصی اہمیت رکھتی ہے جس کا ذکر تاریخ کبیر کشمیر کے مصنف اور اکثر انگریز تذکرہ نگاروں نے بھی کیا ہے۔ مصنف نے للہ عارفہ کی تاریخ پیدائش اور بچپن کے ابتدائی واقعات سے لاعلمی ظاہر کی ہے۔ شادی کا ذکر ہے اور اس کے بعد سسرال کا قیام اور ساس کے سلوک کا ذکر کیا ہے اور اس طرح اس عارفہ کی نجی زندگی کا ایک پہلو ظاہر کیا ہے۔

وہ فوق العادۃ واقعات جو اس عارفہ سے منسوب ہیں ان کا ذکر بھی کیا ہے اور جیسا کہ اس دور کا خاصہ ہے کافی تحقیق سے کام لیا ہے ہر واقعہ کا حوالہ تاریخ کبیر کشمیر کے مصنف اور للہ کے انگریز تذکرہ نگار سے دیا ہے۔

انداز بیاں انتہائی خشک اور بے کیف ہے جس کی وجہ سے ان کے موضوع میں زندگی کی رمق بھی نہیں نظر آتی۔

تذکرہ خواتین دکن

یہ بھی تذکرہ ہے سرزمین دکن کی نامور ممتاز اور صاحب سیف و قلم خواتین ملکہ خونزہ ہمایوں۔ بہرہ دیوی۔ حلوی دیوی۔ والدہ ابراہیم عادل شاہ بیگم حمید خاں۔ رانی پرتھال ملکہ پونجی خاتون۔ روح پرور بیگم۔ چاند بی بی اور سلطانہ بیگم کے حالات درج ہیں۔ لیکن اس تذکرے کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ حالات زندگی کی طرف مصنف کی

توجہ ہی نہیں تھی۔ بلکہ ان خواتین کے چند مخصوص اور تاریخی کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ اور بہت ہی لطف انداز میں۔ چونکہ سیرت نگاری مقصود نہ تھی۔ اس لئے کسی بھی خاتون کے ابتدائی حالات یا ذاتی صفات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اور اگر کہیں کیا بھی ہے تو چند سطروں اور بہت تشنہ الفاظ میں۔ یہاں تک کہ چاند بی بی جیسی مشہور اور دلیر سلطانہ کے ذاتی حالات پہ اس سے زیادہ نہیں لکھا کہ۔

”حسین نظام شاہ کی بیٹی اور عادل شاہ کی بی بی تھی۔
۱۵۴۳ء میں پیدا ہوئی اور احمد نگر میں بچپن کا زمانہ گزارا۔
علاوہ عظمت خاندانی اور عظمت ذاتی کے اپنی عقل و
تدبیر سخاوت اور شجاعت۔ قدر دانی کمال پہ وری کے
جواہرات سے جڑاؤ پتلی تھی۔“

(تذکرۂ خواتین دکن صفحہ ۱۴۹)

اسی طرح بلکہ پونجی خاتون کی ذاتی خوبیوں کے ضمن میں صرف اتنا لکھا ہے کہ

”اس کا اسلامی نام پونجی خاتون تھا آگے چل کر معلوم ہوگا کہ
پونجی خاتون نے بڑے بڑے پولیٹکل مسائل طے کئے ہیں
اور ملکی معاملات کی بہت سی گتھیاں اپنے ناخن تدبیر سے
سلجھائی ہیں۔“

(تذکرہ خواتین دکن صفحہ ۴۲)

سیرت نگاری کی طرف تو توجہ دی ہی نہیں۔ البتہ کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن وہ بھی بڑے بے جان طریقہ سے دراصل منشی محمد الدین فوق سوانح نگار نہیں ہیں بلکہ ان کا رجحان تاریخ کی طرف ہے۔

نورجہاں اور جہانگیر بغیر کسی پیش لفظ یا مقدمہ کے کتاب۔ سن طباعت ۱۹۲۱ء مرزا غیاث کے حالات سے شروع کردی گئی ہے۔ اس لئے پہلی نظر میں مصنف کے رجحان اور خیالات کا اندازہ نہیں ہوتا بڑے خشک انداز میں مرزا غیاث الدین کی بیوی اور بیٹی کے اکبر کے حالات میں داخلے تک کے بعد مہرالنسار اور شاہزادہ سلیم کی ایک دوسرے پر شیفتگی تک پہنچ گئے ہیں۔ جس میں کسی قسم کے ارتقائی مراحل پیش نہیں کئے اور یہاں آکر فوق صاحب اپنے اصل مطلب پر آئے ہیں۔ اگرچہ کتاب میں ابواب کی تقسیم نہیں ہے۔ لیکن اس واقعہ کے اختتام کے بعد جلی حروف میں لکھا ہے۔

"مرزا حیرت کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد"

یہاں سے محسوس ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کا اصلی مقصد مناظرانہ ہے مرزا حیرت کی مصنفہ سوانح عمری "نورجہاں بیگم" کا جواب دیا ہے۔ مرزا صاحب نے حسب عادت مولانا محمد حسین آزاد پہ حملے کئے ہیں۔ اور ان الزامات کی تردید کرنا چاہی ہے جو مورخین نے جہانگیر پر عاید کئے ہیں۔ اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ نورجہاں جہانگیر پر فریفتہ ہوگئی تھی۔ فوق صاحب نے اس کی تردید بڑے زور شور سے کی ہے۔

اور مرزا حیرت کے علاوہ احمد حسن خان بی۔ اے پر بھی اعتراضات کئے ہیں۔ اور ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

"جس کے مصنف احمد حسن خان بی، اے ہیں جو بزعم خود اردو کا سر ڈالٹر سکاٹ بننے کی کوشش کرتے ہیں ہر چند اس ناول میں پروفیسر آزاد کے ان خیالات کا اقتباس کیا گیا ہے جو انھوں نے سلیم اور نورجہاں کی نسبت تحریر کئے ہیں۔ مگر منشی صاحب نے واقعات کو اس طرح الٹ پلٹ کر دیا ہے۔ اور اس قدر غلط بیانی اور محض افسانہ نگاری سے کام لیا ہے۔ کہ اس ناول کو پڑھ کر عقل حیران ہو جاتی ہے۔"

(سوانح عمری نورجہاں وجہانگیر)

کتاب کے مختلف موضوعات حسب ذیل ہیں:۔

مہرالنساء بیگم پر شاہی تربیت کا اثر مذہبی تعلیم، علی قلی خان، علی قلی خان اور مہرالنساء بیگم، علی قلی خان کو تخت بخت ہو گیا۔ جہانگیر نورجہاں پر سو جان سے عاشق تھا۔ نورجہاں پولیٹیکل اسٹیج پر، نورجہاں اور مہابت خاں۔ نورجہاں کی وفات بعمرہ نورجہاں۔ پھر نورجہاں کی حاضر جوابی شاعرانہ لیاقت اور بہادری کا ذکر ہے۔

لیکن کسی ایک موضوع سے بھی خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ بجائے ان کو دلچسپ پیرائے میں بیان کرنے کے بحث و مناظرے

کی طرف پوری توجہ صرف کی ہے۔ باوجود اس کے کہ مصنف کو اپنے موضوع سے جانب دارانہ انس ہے۔ وہ اس کی شخصیت کو دلکش اور جاذب بنانے میں ناکام رہے ہیں۔ جس کا بڑا سبب شیعہ اور سُنی کا افسوسناک فرقہ وارانہ سوال ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فوقؔ صاحب نے مناظرانہ اور معاندانہ سوانح نگاری کا غلط اور افسوسناک استعمال کیا ہے اور اس صنف کی شکل مسخ کردی ہے۔

حیات نور الدین جہانگیر

"سوانح عمری نور جہاں" ہی کا حصہ کہا جاسکتا ہے۔ اگرچہ اس میں وہ مخصوص مناظرانہ پیرایہ اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن فوراً ہی اس امر کا احساس اور اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ مصنف کو اپنے موضوع سے ہمدردی اور انس کے بجائے ایک قسم کا تعصب اور نفرت ہے۔ اور یہ کتاب تنقیص اور تحقیر کے جذبے کے ماتحت لکھی گئی ہے۔ لب ولہجہ کچھ ایسا جارحانہ اختیار کیا ہے کہ قاری کو مطلق اجازت نہیں ہے کہ وہ صاحب سوانح کے متعلق خود کوئی رائے قائم کر سکے۔ کتاب کا ماخذ محمد حسین آزاد کی دربار اکبری معلوم ہوتا ہے۔

جہانگیر کی زندگی ایک ایسا دلچسپ اور بوقلموں موضوع ہے کہ جس میں ایک سچے اور اعلیٰ سوانح نگار کو بڑی دلچسپی محسوس ہوئی اس شاعر مزاج ذکی الحس، باذوق اور رنگین مزاج شاہنشاہ کی زندگی کے پیچ وخم کو بڑے لطف اور حسین پیرائے میں پیش کر سکتا

تھا۔

لیکن ہمارے مصنف نے توجذبہ نفرت کے ماتحت یہ سوانح عمری لکھی ہے اور افسوس تو یہ ہے کہ جہاں انھوں نے صاحب سوانح کو قاری کی ہمدردی سے محروم رکھا ہے۔ وہاں خود بھی اس کی ہمدردیاں حاصل کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اور کتاب پر سرسری نگاہ ڈالتے ہی یہ خیال ہوتا ہے کہ مصنف حد درجہ نفرت اور تعصب کا شکار ہے۔

سوانح عمری ملک العلماء علاّمہ عبدالحکیم سیالکوٹی

فوق کی مذکورہ تصانیف میں ہر لحاظ سے اہم ہے یہ عہد جہانگیری وشاہ جہاں کے ایک زبردست عالم کی مستقل سوانح عمری ہے اور کافی دلچسپی سے لکھی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اس تصنیف میں منشی صاحب مولانا حالی کے طریق تصنیف سے متاثر ہوئے تفصیلی حالات کے علاوہ مولانا کے کاموں اور تصانیف پر بھی تبصرہ کیا ہے۔

فوق کی تصانیف کے انداز سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچھے سوانح نگار نہیں ہیں اور تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

مولوی نذیر احمد کا نام بھی اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے اگرچہ عام طور پر مولوی نذیر احمد اردو ادب میں ناول نگار

اور مترجم کی حیثیت سے متعارف ہیں اور وہ پہلے شخص ہیں جن کی قصہ نویسی میں ناول کے مستقل اور اتنے زبردست عناصر غالب نظر آتے ہیں۔ لیکن یہاں وہ ہمیں ایک سوانح نگار کی حیثیت سے نظر آتے ہیں "امہات الامہ" ان کی وہ مشہور تصنیف ہے۔ جس نے اس ناول کو سوانح نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ اگرچہ امہات الامہ کے علاوہ ان کی کوئی دوسری سوانحی تصنیف نہیں ہے لیکن اس ایک ہی تصنیف کی وجہ سے ان کا شمار بھی سوانح نگاروں میں ہوتا ہے۔

نذیر احمد کی یہ تصنیف بڑے بحث و مباحثہ کا باعث رہی ہے اور اس وقت جب کہ یہ طبع ہو کر عوام کے سامنے آئی۔ علمائے عصر نے اس کو ہدف ملامت بنایا اور سوختنی ٹھہرا کر نذر آتش کر دیا اور لطیف یہ ہے کہ یہ کتاب مصنف نے عیسائی پادریوں اور ان مناظرین کے جواب میں لکھی تھی۔ جنھوں نے رسول اکرمؐ کی کثرت ازدواج پر حملے کئے تھے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اس کے دیباچہ میں ذکر کیا ہے اس کے : علاوہ اپنے مخصوص منطقی اور مدلل انداز میں انسان کی جبلی اور فطری خواہشات کی اہمیت کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کا احترام ایک صحیح اور مکمل انسان پر کس درجہ لازم ہے۔ انھوں نے اس امر پر زور دیا ہے۔ کہ رسول اکرمؐ قطع نظر نبوت اور رسالت کے ایک بشر تھے جو تمام بشری اور مادی خصائص سے متصف ہوتا ہے۔ اور اس طرح عام انسانی معیار اور

اقدار پر ان کے افعال کو پرکھنا چاہیے اور اس عام انسانی سطح پر لاکر نذیر احمد اپنے ہیرو کے اس مرتبہ اور مقام کو فراموش کر بیٹھے جو اس کی امت اور دوسرے انصاف پسند دنیا والوں نے اس کو دے رکھا ہے۔ جو اس کے شایان شان ہے۔ وہ اپنی دھن میں یہ بھول گئے کہ اہل نظر کا قول ہے کہ :۔

"با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار"۔

اور انھوں نے آنحضرتؐ اور امہات المومنین کی سوانح حیات لکھنے کے لئے وہی زبان استعمال کی ہے جو وہ اپنی ناولوں میں استعمال کرتے ہیں۔

دراصل وہ دکھانا یہ چاہتے تھے کہ آں حضرتؐ نے مختلف اوقات میں یہ عقد زیادہ تر ملکی اور پیغمبرانہ مصلحتوں کی بنا پر کئے تھے۔ اور اس سے محض تعداد ازدواج کا بڑھانا مقصود نہ تھا اپنے دعوت کی تائید میں مولوی صاحب نے آں حضرتؐ کی خانگی اور نجی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ یہ ایسا موقع نہ تھا کہ محض اپنی مسرت اور راحت کے لیے آنحضرتؐ کثرت ازدواج کو گوارا کرتے بلکہ آپؐ کی زندگی تو بڑی کٹھن آزمائش تھی۔ اور اس میں ہر قسم کی تکالیف اور مشکلات تھیں کبھی دو وقت کا کھانا بھی اطمینان سے نہ ملا۔ اور اکثر گھر میں چراغ بھی نہ جلتا۔ غرض کہ اس زندگی کا نقشہ بڑی اچھی طرح کھینچا ہے۔ لیکن ان سے یہی شکایت ہے کہ بڑے

عامیانہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ چونکہ وہ پہلے ناول نگار ہیں، اور بعد میں بھی اور اس لئے وہی پیرایہ اختیار کیا ہے۔ بعض دفعہ مکالموں کی وجہ سے یہ رنگ اور بھی گہرا ہو گیا ہے مثلاً۔

"ابو سفیان اور ہرقل قیصر روم کا مکالمہ"

(امہات الامہ صفحہ ۱۵۳)

نذیر احمد صاحب نے اپنی ناولوں میں بھی جو زبان استعمال کی ہے۔ وہ عورتوں اور بڑی بوڑھیوں کی سی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی بھی وہی زبان ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کسی منطقی اور محقق مولوی کے بجائے کسی کونے میں تخت پر بیٹھی ہوئی بڑی بی اپنے الفاظ میں یہ واقعات بیان کر رہی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ام سلمہؓ کی ہجرت کا حال اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

"بنو مغیرہ کو جب ہمارے چلنے کی خبر ہوئی اور یہ میرے میکے کے لوگ تھے تو انھوں نے آکر میرے شوہر ابو سلمہؓ کی مزاحمت کی اور سختی سے کہا تم ہماری لڑکی کو کہاں لئے جاتے ہو، تمہیں اپنی ذات کا اختیار ہے۔ جہاں چاہو خدائی خوار مارے مارے پھرو ہم اپنی لڑکی کی یوں مٹی خراب نہیں ہونے دیں گے۔ بھلا یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے۔ عورت ذات اور وہ بھی بچے والی یوں بے سروسامان جنگلوں بیابانوں میں تمہارے ساتھ سرگرداں پھرے"

(امہات الامہ صفحہ ۱۲۶)

غرض یہ کہ اس قسم کی زبان استعمال کی ہے۔ اس سے ایک بات تو یہ ہوئی ہے کہ واقعات تو زیادہ نزدیک اور سچے معلوم ہونے لگتے ہیں مگر بعض وقت وہ حد سے تجاوز بھی کر گئے ہیں۔ اور بعض چھوٹے چھوٹے واقعات اور معمولی مخالفتوں کا ذکر ایسے انداز میں کیا ہے کہ وہ بہت بڑی اور ناخوشگوار باتیں معلوم ہونے لگی ہیں۔ اگرچہ یہ کتاب انھوں نے اپنے اشخاص سوانح کی حمایت میں لکھی ہے۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان سے مصنف کو جذباتی وابستگی اور ہمدردی نہیں ہے۔ اعتراض کے جن ناگوار داغوں کو نذیر احمد نے ان مقدس دامنوں پر سے دھونا چاہا تھا۔ اس سے زیادہ گہرے داغ خود ان کے قلم کی بے راہ روی نے ان دامنوں پر لگا دیئے ہیں۔ انھوں نے بار بار امہات المومنین اور حضرت فاطمہ رض کے بارے میں تریاہٹ اور تریا چرتر کا لفظ استعمال کیا ہے۔

"ہمارے ملک میں عورتوں کا طبعی خاصہ تریاہٹ اور تریا چرتر بھی مانا گیا ہے۔ تو وہی بات ہم فاطمہ رض اور عائشہ رض میں بھی پاتے ہیں۔"

(امہات الامہ صفحہ ۱۰۷)

"زلیخا کا چرتر تو قرآن سے معلوم کر سکتے ہو عائشہ رض کا چرتر یہ تھا کہ وہ دل سے تو باپ کی امامت چاہتی تھیں۔ اور

"اس وقت ظاہر ہیں تو باپ کو ناقابل امامت بنایا مگر بات ایسی کہی جس سے ظاہر ہوا کہ ابو بکرؓ سے بڑھ کر پیغمبر صاحب کا کوئی خیر خواہ نہیں ۔"

(امہات الامہ صفحہ ۱۰۸)

آں حضرتؐ کی اولاد کے بارے میں اس قسم کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

"آں حضرتؐ کی نسل نے دنیا میں فتنہ و فساد قائم کیا آں حضرتؐ کی اولاد نرینہ ہوتی تو نوح کے نااہل بیٹے جیسی ہوتی"

(امہات الامہ صفحہ ۱۰۲)

ان اقتباسات کے علاوہ بھی بے شمار ناشائستہ فقرات اور جملے استعمال کئے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مصنف نے جان بوجھ کر یہ الفاظ کسی تحقیر کے خیال سے استعمال نہیں کئے ہوں گے اور بقول بشیر الدین احمد صاحب مرحوم

"بعض جگہ شوخیِ طبع سے کوئی فقرہ رد میں نکل گیا اور کوئی ایسی بات نہ پائی جس سے اسلام کی توہین یا مسلمانوں کی دل آزادی مقصود ہو۔"

(امہات الامہ صفحہ ۴)

تاہم ان کی اس عامیانہ زبان سے ان کے فن پر بڑا اثر پڑا ہے جس طرح یہ زبان ناول نگاری کا وصف بن گئی تھی۔ اسی طرح اس فن کا

عیب بن گئی ہے۔

انھوں نے تو اپنی طرف سے معترضین کا منہ توڑ جواب ہی دینا چاہا تھا۔ لیکن نہ جانے خود ان کی بدقسمتی ہے یا ان کے قلم کی کہ انھوں نے جب بھی کسی کے بارے میں اپنی رائے قائم کر کے رائے عامہ کو اس کی طرف کرنا چاہا۔ معاملہ الٹ گیا۔ انھوں نے مراۃ العروس کی ہیروئن "اصغری" کی حمایت اور طرف داری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن رائے عامہ ان کی مردود اور مطعون "اکبری" کے حق میں ہو گئی۔ انھوں نے "نصوح" کو مثالی کردار بنا کر پیش کیا اور لوگ چپکے چپکے "کلیم" کو سرا ہنے بیٹھ گئے۔

یہی حال امہات الامہ میں ہوا۔ ان کے الفاظ نے بساط ہی الٹ دی اور وہ قاری بھی جو کہ آنحضرتؐ اور ان کے اقرباء کے لئے انتہائی عقیدت کا جذبہ رکھتا ہے۔ اس کتاب کو ختم کرنے کے بعد اپنی عقیدت میں کمی محسوس کرتا ہے۔ اور اس طرح نذیر احمد کو ایک ناکام سوانح نگار کہا جا سکتا ہے کہ باوجود خواہش کے وہ اپنے پسندیدہ اشخاص کا کوئی اچھا اثر قائم نہ کر سکے تاہم ان کی تحقیق اور کوشش قابل توجہ ہے اور شاید اسی لئے علامہ بلگرامی مرحوم نے آرزو کی تھی کہ "کاش امہات الامہ کا ترجمہ میں کرتا۔"

(امہات الامہ صفحہ ۴)

اس دور کے لکھنے والوں میں شاید ہی کوئی اہل قلم نکلے

جس نے فن سوانح نگاری پر قلم نہ اٹھایا ہو چنانچہ مولوی عبدالحلیم شرر کا نام بھی اس سلسلہ میں لیا جاتا ہے۔

مولوی عبدالحلیم شرر ایڈیٹر دلگداز کو اکثر اردو کے سروالٹر سکاٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور انھوں نے اپنی ناولوں کی بنیاد تاریخی واقعات اور قصوں کو بنایا ہے۔ اگرچہ ان کے فن میں سروالٹر سکاٹ کی سی پختگی مطابقت اور فنی شعور مفقود ہے تاہم ان کی تاریخ کی دلچسپی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

مولوی عبدالحلیم شرر نے اپنے ناولوں کو تاریخی رنگ دینے کی کوشش کی اور ان کو ماضی کے قصوں میں بڑا حسن اور دلکشی نظر آئی اور مختلف طریقوں پر انھیں اپنا موضوع بنایا۔ چنانچہ دلگداز میں سیر نسواں کے نام سے ایک سلسلہ جاری کیا جس میں بلاتخصیص مذہب وملت رنگ ونسل تمام دنیا کی مشہور اور معروف عورتوں کے حالات تحریر کئے۔ ایک اور سلسلہ مضامین سیر رجال کے نام سے شروع کیا۔ اس میں بھی مختلف زمانوں میں مذہب وملت کے ناموروں کے قصے لکھے ہیں۔ اس سلسلہ میں محض ان لوگوں کی تخصیص نہیں کی ہے جنھوں نے بڑے بڑے کارنامے کئے ہیں بلکہ کسی بارے میں بھی نیک نام یا بدنام شخص کو قابل اعتنا سمجھا ہے مثلاً قیس عامر جو صحرائے عرب کی ایک کالی رنگت والی دوشیزہ کے پیچھے عقل وخرد سے بیگانہ ہو گیا تھا اس کا بھی ذکر

جہاں تک ان کی معلومات نے ساتھ دیا تحقیق کی روشنی میں کیا ہے اور اسی طرح بڑے بڑے سپہ سالاروں بادشاہوں عالموں اور محققوں کا ذکر کیا ہے۔

ان کے یہ چھوٹے چھوٹے مضامین خاکے کہے جا سکتے ہیں جن میں اشخاص کی زندگی کے مخصوص پہلوؤں ہی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شرر ناول نگار ہیں اور ان کا قلم رنگین اور ننگی عبارتیں لکھنے کا عادی ہے چنانچہ انھوں نے اپنے سوانحی خاکوں کو بھی ناول کا رنگ دے دیا ہے

ناول اور سوانح کی جمالیاتی اقدار میں بڑا لطیف فرق ہے۔ ناول میں بھی سوانح عمری کی طرح کسی مخصوص شخص کی زندگی پیش کی جاتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ناول کے کردار اور واقعات فرضی ہی ہوتے ہیں اور ناول نگار اس امر کا مجاز ہوتا ہے کہ کردار واقعات کو اپنی مرضی اور اسکیم کے مطابق جس رخ چاہے چلائے۔ اس میں صرف وہ سلیقہ درکار ہے جو فرضی واقعات اور باتوں کو اصلیت کا روپ دے سکے۔ لیکن سوانح عمری میں مخصوص اور مقررہ واقعات ہی سوانح نگار کا مقسوم بن جاتے ہیں۔ اور وہ ان سے سرمو تجاوز نہیں کر سکتا۔ اس کا کمال اور ہنر مندی اسی میں ہے کہ وہ ٹھوس اور جانے بوجھے حقائق کو اس انداز اور سلیقہ سے بیان کرے کہ وہ ان میں زندگی دلکشی اور انوکھا پن پیدا ہو جائے۔ شرر کو یہ ترکیب خوب آتی ہے۔ اگرچہ وہ ناول میں زندگی اور حقیقت پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

لیکن اپنے سوانحی خاکوں میں انھوں نے ناول کی دلکشی اور حسن کو موویا ہے۔ اسی بات کو جسے وہ معمولی پیرائے میں بیان کر سکتے ہیں۔ کچھ ایسے الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ اس واقعہ یا بات کی دلکشی میں دو چند و سہ چند اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً علیہ بنت مہدی نے سرپیچ ایجاد کئے اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

علیہ کی جبین ناز پر ایک مسہ تھا جو کسی قدر عیب دیتا تھا اور خوبصورت گورے مکھڑے پر جو چاند کا ٹکڑا تھا کلف بن کر نمودار رہتا۔ اس عیب کو چھپانے کے لئے نظر فریب و مکلل بہ جواہر سرپیچ ایجاد کئے۔

(سیر النسوال صفحہ ۷۵)

اسی طرح دلچسپ حکایتوں اور واقعات کی تکنیک سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ اسی علیہ کی معصومیت بھولپن اور سعادت مندی کا واقعہ بیان کر کے اس کی ان صفات کو واضح کیا ہے۔ علیہ ایک باکمال شاعرہ تھی اور شعرائے عرب کے دستور کے مطابق ایک جیتے جاگتے محبوب کا ذکر بھی ضروری تھا۔ چنانچہ علیہ کی نظر انتخاب ہارون کے دو خوش جمال غلاموں رشا اور طل پر پڑی اور ان کے خیال وجمال کی مدد سے اپنے زندگی اور حسن بھرا کرتی تھی جس میں طل کی نسبت زیادہ پر شوق الفاظ استعمال کئے ہیں ہارون الرشید نے بہن کو اس سے منع کیا اور قسم لے لی کہ طل کا ذکر نہ کرنا اور اس سے راہ مراسم چھوڑ دے

لیکن قسم لینے کے بعد بھی ہارون کو شبہ رہا اور اکثر خاموشی سے علیّہ کے کمرے کی طرف جا کر اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ چنانچہ شررؔ ایک دن کا دلچسپ واقعہ لکھتے ہیں۔

"ایک دن گیا تو علیّہ تلاوت کلام مجید میں مصروف تھی۔ اور ایسی خوش گلوئی سے قرأت کر رہی تھی کہ رشید کا دل لگ گیا دیر تک چپکا کھڑا سنتا رہا علیہ سورہ بقر پڑھ رہی تھی پڑھتے پڑھتے جب اس آیت پر پہونچی۔" فان لم یصبا وابل فطل "تو ساری آیت پڑھ گئی مگر "فطل" کے لفظ پہ پہنچ کے بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔

"کالذی منعنا منہ امیر المومنین"

یعنی وہی جس سے امیر المومنین نے منع کیا ہے۔ اس واقعہ سے رشید پر عجیب اثر ہوا بے تاب ہو کے اندر گھس گیا۔ بہن کو گلے سے لگا لیا پیشانی چومی اور کہا۔

لو میں نے طل تمہیں دے ڈالا۔"

(مضامین شرر صفحہ ۷۶)

بعض جگہ مکالموں سے بھی ان خاکوں میں ناول کا رنگ دیا ہے اور اس طرح دیہ دلچسپ اور اچھے خاکے بن گئے ہیں۔

ان سوانح نگاروں میں ایک اہم نام مولوی عبدالرزاق کانپوری کا ہے۔ اس باب میں اب تک جن سوانح نگاروں کا ذکر کیا جا چکا ہے

عبدالرزاق صاحب ان سب سے زیادہ اس فن سے واقف ہیں خود اپنی علمیت اور استعداد کے علاوہ وہ مولانا حالی اور مولانا شبلی کے تصور اور فن سوانح نگاری سے واقف اور متاثر ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اپنا مزاج بھی سوانح نگار کا مزاج ہے اور وہ سوانح نگاری اور تاریخ کے خفیف لیکن اہم فرق سے بھی واقف ہیں۔ اور انھوں نے مشرق و مغرب کے تصور سوانح کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔

اپنی مشہور اور گراں قدر تصنیف "البرامکہ" کے دیباچے میں کار لائل اور ڈاکٹر اسمائلس کے مقولوں کے علاوہ مولانا حالی کی حیات سعدی کے دیباچے سے بھی اقتباسات دیئے ہیں۔ ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا بھی حالی اور شبلی کی طرح یہی خیال ہے کہ انہی لوگوں کے حالات لکھنے کے قابل ہیں جنھوں نے دنیا میں کارہائے نمایاں کئے ہیں اور ان کو شبلی کا یہ خیال بہت پسند آیا۔ کہ "سلسلۂ ناموران اسلام" شروع کیا جائے اور سلطان فرماں رواؤں کے حالات زندگی لکھنا شروع کئے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں۔

"لیکن نہایت خوشی ہے کہ سب سے پہلے ہمارے محترم قبلہ صاحب التعظیم شمس العلماء مولانا مولوی محمد شبلی نعمانی فیلو یونیورسٹی الہ آباد۔ و پروفیسر مدرستہ العلوم علی گڑھ نے ایک سلسلہ رائل ہیروز آف اسلام: (ناموور فرماں روایان اسلام) کا لکھنا شروع کیا ہے"

(البرامکہ دیباچہ صفحہ ۶)

اسی خیال سے متاثر ہو کر انھوں نے سلسلہ ناموروزرائے اسلام شروع کیا اور البرامکہ کو منتخب کیا۔ چنانچہ اس کا ذکر اپنے دیباچہ میں کرتے ہیں۔

"میں نے بھی بوگرافی پر قلم اٹھایا ہے اور اس مقصد کے واسطے خاندان برمکہ کا انتخاب کیا ہے جو خاص فضائل سے منسوب تھا۔ برامکہ کے جود و کرم کے افسانے اور علمی کارنامے بطور ضرب المثل کے آج تک تاریخوں میں یادگار ہیں۔"

(دیباچہ صفحہ ۱۴)

انھوں نے اس خاندان کے مفصل حالات بطور تذکرے کے ترتیب وار لکھتے ہیں جن کا مقصد ان کا نام زندہ کرنے کے علاوہ یہ بھی تھا۔

"ان کے فضل و کمالات سے قوم میں ایک عمدہ تحریک پیدا ہو"

(دیباچہ صفحہ ۱۵)

اس کے علاوہ آل برمکہ کے اس تذکرے سے مصنف کا ایک مقصد اور بھی تھا وہ ہارون رشید کے دامن سے اس بدنما داغ کا دور کرنا تھا جو آل برمک کے قتل سے اس پر لگ چکا تھا۔ کتاب کے خاتمہ پر لکھتے ہیں خاندان برامکہ اور ہارون الرشید کی لڑائی لکھتے ہیں جس

تذمومنت ہیں نے کی ہے۔ اس کی علت غائی شہرت وناموری جلب منفعت کی توقع یا قوم سے ستائش کی تمنا نہیں ہے۔ بلکہ اصلی مقصد اور صدق عقیدت یہ ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید عباسی سے جو خاندان رسالت کا ایک ممبر ہے وہ غلط اور بے ہودہ الزام دور کروں جو خلافت اور وزارت کے باہمی میل جول اور یک جہتی سے تا زیخوں ہیں پایا جاتا ہے۔

(البرامکہ صفحہ ۳۲۶)

ان کے اس انتخاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالرزاق میں تاریخ وسوانح نگاری کا بڑا لطیف اور معتدل امتزاج تھا۔ سوانح نگار جب اپنی توجہ تمام دنیا سے ہٹا کر کسی مخصوص شخصیت کی طرف مرکوز کرتا ہے تو اس انتخاب کا جواز بھی ہوتا ہے۔ سوانح نگار میں لگاؤ محبت اور شفقت کا مادہ ہوتا ہے۔ اور مورخ بے رحم اور بے گانہ فطرت کا حامل ہوتا ہے تاریخ وسوانح کے نقادوں نے مورخ اور سوانح نگار کا فرق ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"سوانح نگار اور مورخ کا فرق پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر اور آپریشن کرنے والے سرجن کا سا ہے۔ اول الذکر بے دردی و بے رحمی سے کاٹ چھانٹ کرتا ہے۔ اور موخرالذکر احتیاط نرمی اور ہمدردی سے نازک رگوں

کو چھیڑتا ہے ۔

ظاہر ہے کہ یہ زبردست فرق ہے لیکن یہ کسی ڈاکٹر کی خوش نصیبی ہے کہ اس میں ہر دو صلاحیتیں جمع ہو جائیں وہ ایک کامیاب اور ہمدرد سرجن بھی ہو اور موقع پر ایک بے رحم اور بے گانہ پوسٹ مارٹم کرنے والا بھی بن سکے یہی صفت مولوی عبدالرزاق میں موجود ہے ۔ ان کے دل میں اپنے اشخاص قصہ کے لئے انتہائی محبت اور احترام کا جذبہ ہے لیکن یہ جذبہ وسیع ہے محدود نہیں ہے ۔ اس کی وسعتیں خاندان برامکہ کے حریف ہارون الرشید کے لئے بھی ہیں ۔

انھوں نے جہاں تک سوانح عمری کا تعلق ہے ۔ ایک اچھے اور متین سوانح نگار کا فرض ادا کیا ہے ۔ لیکن جہاں حقائق اور واقعات کا موقع آیا ہے ۔ ان کا طریق کار اس مورخ یا سائنس دان کا سا ہو جاتا ہے جو اپنے موضوع کو اسی زاویے سے دیکھتا ہے جس سے اس کو کام لینا ہوتا ہے ۔

چنانچہ جہاں وہ آل برمک کے زوال و تباہی پر دل سے متاسف ہیں اور ان کو ہارون الرشید کا یہ فعل غیر مستحسن اور یہ اقدام غلط نظر آتا ہے وہاں وہ ان اسباب و علل کو بھی نظر انداز نہیں کرتے جو آل برمک خصوصاً جعفر کی بعض بداعتدالیوں کا نتیجہ ہیں ۔

ایک سوانح نگار کا دل ہی جانتا ہے کہ یہ کیسا نازک مرحلہ ہے ایک طرف تو فن کا تقاضا ہے کہ صحیح راہ پر دیانت داری سے

چلو دوسری طرف منتجہ شخصیت کی محبوبیت قدم قدم پر قلم پکڑتی ہے لیکن عبدالرزاق صاحب اس مرحلہ سے بخیر و خوبی گزر گئے۔ ان کا طرز بیان بڑا معتدل اور سنجیدہ ہے وہ اپنے اشخاص تذکرہ کی حقیقی عظمتوں کا ذکر بھی بڑے متین اور باوقار انداز میں کرتے ہیں۔ ان کا قلم ہر قسم کی بے راہ روی سے پاک ہے اور اپنے ہیروؤں کی تعریف بڑے جامع اور معتبر الفاظ میں کرتے ہیں مثلاً فضل برمکی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"مختصر الفاظ میں فضل کی یہ تعریف ہے کہ وہ تیغ و قلم دونوں کا مالک تھا۔ جس طرح اس کی تلوار کی سطح زمین پر یادگاریں باقی ہیں۔ ویسے ہی اس کی قلمی فتوحات کے دفتر آج ہمارے پیش نظر ہیں مستند مورخین (ابن خلکان) نے خاندان برامکہ پر ریمارک کرتے ہوئے یہ تسلیم کیا ہے کہ۔ "فیاضی میں فضل سب سے افضل تھا۔ اگرچہ بلاغت اور انشا میں جعفر فضل پر فائق تھا۔ زمانہ جاہلیت کو اگر حاتم طائی پر فخر ہے تو عہد اسلام کو فضل پر ناز ہے۔"

(البرامکہ صفحہ ۱۴۸)

اس کے باوجود ایک جگہ بڑی صاف گوئی سے لکھتے ہیں کہ "فضل برمکی بغایت نخوت پسند تھا۔" اگرچہ ساتھ ہی یہ بھی ثابت کر دیتے ہیں کہ اس کی یہ نخوت پسندی عادت سے زیادہ ادا میں شمار کی جا سکتی ہے۔ یہ ثبوت کسی لمبے چوڑے لیکچر سے نہیں دیا ہے۔ بلکہ ایک معمولی سے واقعہ کے

ممن صفائی پیش کردی ہے اور قاری کو یہ محسوس ہونے نہیں دیا ہے کہ مصنف بہ جبر اپنا یہ خیال منوانا چاہ رہا ہے۔

اسی طرح تمام نقائص اور واقعات مختلف روایتوں اور تحقیقی قصوں ہی کے ذریعہ بیان کئے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ ہم کو آلِ برمک کے زوال کی طرف لاتے ہیں۔ اور کچھ پہلے ہی سے اس امر کا متوقع بنا دیتے ہیں لیکن کچھ اس ترتیب اور طریقہ سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں کہ اس میں ایک خزینہ کا سا (Suspence) تعطل پیدا ہوتا ہے۔ اور پڑھنے والا اس جانے بوجھے انجام کی طرف شوق تجسس کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی وہ کشاکش (Conflict) جو ہارون اور جعفر کے دلوں میں برپا ہے قاری کے ذہن میں بھی حشر برپا کر دیتی ہے۔ اور اس طرح یہ سنجیدہ تذکرہ ایک ایک حزینہ کے عظمت اور حسن کا حامل بن جاتا ہے اور ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا مصنف نہ صرف ایک سوانح نگار کا دل اور مورخ کا مزاج رکھتا ہے۔ بلکہ اس کا قلم اس ادبی حسن کا بھی حامل ہے جو کسی فن پارے میں ابدیت کے عناصر پیدا کر دیتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبدالرزاق صاحب "لائف اینڈ ٹائمز" کے انداز پر سوانح عمری لکھنے کے قائل نہ تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے وہ سیاسی اور تمدنی پس منظر پیش نہیں کیا ہے جس میں برامکہ نے اپنے کارنامے سرانجام دیئے عروج کی انتہائی منزلوں پر پہنچ کر زوال کی آخری حدوں کو بھی دیکھا۔

حقیقت یہ ہے کہ عبدالرزاق صاحب اپنے وقت کے بلند پایہ سوانح نگار ہیں۔ اور ان کی مایہ ناز تصنیف "البرامکہ" اردو کی اعلیٰ اور بلند تصانیف میں سے ہے۔ اسی سلسلہ کے ایک اور مصنف قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری جج ریاست پٹیالہ ہیں۔ اگرچہ یہ بیسویں صدی میں موجود تھے۔ لیکن ان کا شمار عہد سرسید ہی کے سوانح نگاروں میں کرنا چاہیئے۔ ان کی متعدد تصانیف میں سے اصحاب البدر، تاریخ المشاہیر اور رحمتہ للعالمین سوانحی تصانیف ہیں۔

اصحاب البدر

جنگ بدر کے تفصیلی حالات اور اس میں حصہ لینے والے ۳۱۳ صحابہ کرام رضؓ کا مختصر تذکرہ ہے قاضی صاحب کا رجحان تاریخی تحقیق کی طرف زیادہ ہے اور تذکرہ بھی تاریخی مقاصد کے پیش نظر مرتب کیا ہے۔ غزوۂ بدر کے اسباب و حالات پر تفصیلی اور تاریخی روشنی ڈالی ہے۔

اصحاب بدر کا تذکرہ مہاجرین کے عنوان سے شروع کیا ہے اور سب سے پہلے مہاجر یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شروع کیا ہے یہ تذکرہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے دوسرے تمام تذکروں سے جدا گانہ ہے اور پڑھنے والا قاضی صاحب کی تحقیق و تجزیہ کا قائل ہو جاتا ہے۔ موصوف نے بڑی محنت و توجہ سے اس کو مرتب کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنہ ولادت کو تمام دنیا کے مروجہ و مشہور سنین کی مطابقت سے پیش کیا ہے۔ اور ہر قوم و مذہب کے لوگ آپ کی تاریخ ولادت

اپنے سنین کے حساب سے معلوم کر سکتے ہیں۔

اسی طرح دوسرے تمام واقعات اور حالات کو بھی مختلف سنین اور تواریخ کے حساب سے بیان کیا ہے مثلاً بعثت نبوت کا سنہ، مکہ میں تبلیغ کی مدت۔ معراج، ہجرت مدینہ منورہ کی مدت قیام اور وفات ان سب کا حساب لگا کر لکھتے ہیں۔

"عالم دنیوی میں حضورؐ نے ولادت سے لے کر وفات تک ۲۲۳۳۰ دن چھ گھنٹے قیام فرمایا اور یہ چھ گھنٹے اکتیسویں دن میں لگے۔"

(اصحاب البدر صفحہ ۲۱)

پھر ان تمام ایام میں سے بھی تبلیغ رسالت و نبوت کے دنوں کی تعداد یعنی ۸۶۵۶ دن تبلیغ رسالت و نبوت کے بھی نکال کر بتا دیے ہیں آں حضرتؐ کے متنازو مشہور لقب اور قرآن کریم میں جن مخصوص اور پسندیدہ خطابات سے آپ کو مخاطب کیا گیا ہے ان کی فہرست مختصر شجرۂ نسب حضورؐ جن غزوات میں بہ نفس نفیس شریک ہوئے ان کی تعداد و فہرست سب درج کر دیا ہے۔

غرض یہ کہ آن حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اہم دلچسپ معلومات کا مختصر اور جامع ذخیرہ پیش کر دیا ہے۔ اس نوع کے تذکرے کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے۔ جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ بچوں اور طلبار کی بھی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے

تحریر کیا ہے۔

"حضور پرنور کے حالات مبارکہ بچوں کو ہماری کتاب مہر نبوت میں اور اہل علم کو رحمۃ اللعالمین میں مطالعہ کرنے چاہئیں۔"

(اصحاب البدر صفحہ ۲۲۳)

خلفائے راشدین کے ذکر میں ان کے تعارف کے بعد ان کے مخصوص فضائل نمبروار گنوا دیئے ہیں اور آں حضرتؐ کے حالات میں بھی دیگر اصحاب کی بہ نسبت کسی قدر تفصیل سے کام لیا ہے۔ لیکن اس میں تاریخی عنصر زیادہ غالب نظر آتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے تذکرے میں سوانحی عنصر قدرے غالب ہے۔ کیونکہ اس میں فضائل اور تاریخی واقعات کے علاوہ ان کی شخصیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے ان کا حلیہ بھی لکھا ہے اس کے علاوہ ایک نئی چیز پر بھی روشنی ڈالی ہے یعنی حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ کے باہمی تعلقات جن کے متعلق لکھتے ہیں۔

"مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ہر دو بزرگوں کے تعلقات کو بھیانک اور گھناؤنی صورت میں دکھلایا کرتے ہیں لیکن اس کی کچھ اصلیت نہیں۔"

(اصحاب البدر)

قاضی صاحب نے چند ایسے واقعات کا ذکر کر کے جن سے ہر دو حضرات کے خوشگوار تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا ہے

حضرت عثمان رضؓ کے تذکرے میں تاریخی عنصر غالب ہے۔ حضرت علیؓ کے ذکر میں سوانحی غرض اسی طرح اپنے اس مختصر تذکرۂ رجال میں قاضی صاحب نے اصحاب البدر کو ہم سے متعارف کروا دیا ہے۔ دراصل اس سے سوانح نگار سے زیادہ مورخ استفادہ حاصل کر سکتا ہے۔

قاضی صاحب کی دوسری مشہور تصنیف رحمۃ اللعالمین ہے۔ جس طرح مولانا شبلی کی بہترین تصنیف اور شاہکار سیرت النبیؐ ہے اسی طرح قاضی سلیمان کی تمام تصنیفوں میں رحمۃ اللعالمین ہی مشہور اور پسندیدہ مانی گئی ہے۔ اور اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ مصنف ایک سیدھے اور سچے مسلمان تھے۔ جن کی آنحضرتؐ کے ساتھ محبت اور شیفتگی انتہائی حدوں کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ سیرت نبویؐ کو لکھنا معمولی کام نہ سمجھتے تھے اور ان کو یہ بھی احساس تھا کہ ان جیسا کثیر المشاغل شخص اس فرض سے خیر و خوبی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس معاملے میں وہ بے حد محتاط تھے اسی قدر اس کو کرنے پر مستعد تھے۔ جس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں۔

"ایک فرض کا احساس ہے۔ جو سکوت پر غالب آگیا ہے۔
اور درد محبت ہے جس نے بے حس قلب کو تڑپا دیا ہے۔
توفیق الہٰی ہے جو برابر اس کام پر مجھے لگائے رکھتی ہے۔
جذبۂ ربانی ہے جس کی کشش طریق حق پر لئے جاتی ہے۔"

(صفحہ ۵ جلد دوم رحمۃ اللعالمین)

چنانچہ اس شوق بے حد اور جذبۂ بے تاب کی راہ نمائی میں انھوں نے یہ مقدس کام شروع کیا۔ اور اس سلسلہ میں پوری احتیاط کی ہے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کے وہ تمام امتیاز اور محاسن جو اس دور میں کسی بھی حیثیت سے پیش کرنے کے لائق تھے اس کا پورا استقصا کیا ہے ان کی اس تصنیف کی اہمیت کا اندازہ سید سلیمان ندوی کے دیباچہ سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے اس کی جلد سوم کے شروع میں لکھا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ سید سلیمان ندوی اس میدان کے مرد ہیں۔ اور انھوں نے اپنے واجب التعظیم استاد مولانا شبلی نعمانی کی مایۂ ناز لیکن نامکمل تصنیف سیرت النبیؐ کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا ہے۔ اور وہ سیرت نبویؐ کی اہمیت اور مشکلات سے بخوبی واقف ہیں۔ سید صاحب لکھتے ہیں۔

"مرحوم نے اسلام کے فضائل میں تفسیر و تاریخ میں اپنی متعدد یادگاریں چھوڑی ہیں۔ مگر ان سب میں بہتر اور جامع ان کی تصنیف رحمۃ اللعالمین ہے۔"

(دیباچہ صفحہ ۹)

سید صاحب کے دیباچہ ہی سے اس کتاب کی نوعیت اور خصوصیت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

رحمۃ اللعالمین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف کے ذوق سوانح اور واقعات کے ساتھ غیر مذاہب کے اعتراضات کے جوابات اور دوسرے

صحف آسمانی کے ساتھ موازنہ اور خصوصیت سے یہود و
نصاریٰ کے عادی کا ابطال بھی اس میں جا بجا موجود ہے
(دیباچہ صفحہ ۹)

چنانچہ معلوم ہو جاتا ہے کہ قاضی صاحب نے اپنے متقدمین اور معاصرین کے دستور کے مطابق اس تصنیف سے سوانح اور مناظرے دونوں کا کام لیا ہے

کتاب کی تین جلدیں ہیں پہلی جلد میں صرف وہی حالات ہیں جو خاص رسول اکرمؐ کی ذات سے متعلق ہیں ۔ بیان میں اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ ہر واقعہ کو علیٰحدہ فصل اور عنوان کے تحت بیان کیا ہے جس سے تسلسل میں بڑی کمی آگئی ہے ۔ اور سوانحی انداز سے زیادہ مورخانہ انداز کی ہو گئی ہے

دوسری جلد میں آں حضرتؐ کی ذات گرامی کے علاوہ شجرہ غزوات ازواج مطہرات کی فہرست مع حالات دی گئی ہے اور اس کا سبب یہ بتاتے ہیں ۔

"جلد دوم میں ایسے ضروری مضامین ہیں جن میں بعض کو علما سیرت آغاز کتاب ہی میں جگہ دیا کرتے ہیں ۔ مگر میں نے حصہ اول کو صرف ایسے مالا بدمنہ حالات مبارکہ پر اختصار کے ساتھ ملتوی رکھا تھا کہ اگر بقیہ جلدیں شائع نہ بھی ہو سکیں تب بھی وہ ناتمام کی صورت میں نامکمل نظر

نہ آئے۔

(دیباچہ جلد دوم صفحہ ۵)

اس جلد کی تکمیل و ترتیب میں مصنف نے جس محنت اور توجہ سے کام لیا ہے۔ وہ قابل تحسین ہے۔ اس جلد میں ہمیں بہت سی ایسی نئی چیزیں بڑے منظم انداز میں نظر آتی ہیں جو کسی دوسری سیرت النبیؐ میں نہیں ملتی ہیں۔ مثلاً ان تمام غزوات و سرایا کی ایک فہرست اور نقشہ کیفیت جن میں رسول اکرمؐ نے آٹھ سال کے اندر حصہ لیا تھا۔ اس نقشہ کی ترتیب یوں ہے۔!

۱۔ غزوہ یا سریہ کا نام مع تاریخ
۲ لشکر اسلام کی تعداد مع نام سردار
۳۔ لشکر دشمن کی تعداد مع نام سردار
۴۔ نقصان مسلمانوں میں زخمی اسیر یا شہید۔
۵۔ نقصان دشمن کا زخمی اسیر یا مقتول۔
۶۔ کیفیت۔

اسی طرح ان تمام شہداء کی فہرست باعتبار غزوات جنھوں نے ان میں حصہ لیا بھی درج کی ہے۔

آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات کے ذکر سے پہلے ان کے شجرات درج کئے ہیں۔ ان کے مختصر حالات کے علاوہ معترضین کے ان اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے جو انھوں نے آنحضرتؐ پر کئے ہیں

اس کے بعد آں حضرتؐ کی تمام خصوصیات اور عادات کا ذکر جو اور انبیا علیہم السلام کے مقابلہ میں آپ میں موجود تھیں ترتیب وار علیحدہ علیحدہ فصول میں کیا ہے۔

مصنف کی بڑی کوشش یہی رہی ہے کہ اپنے صاحب سوانح کے متعلق جو کچھ بیان کریں اس پیرائے میں بیان کریں کہ قاری کے دل میں اس کے لئے جذبۂ محبت اور احترام زیادہ سے زیادہ پیدا ہو۔ چنانچہ اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

"یاد رکھنا چاہیے کہ عبیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لکھنے کا مقصد اس خاکسار کا بلکہ علمائے کبار کا بھی ہوتا۔ چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود باوجود کے متعلق پڑھنے والے کے قلب کو ایمان قرار کو اطمینان روح کو راحت اور صدر کو انشراح حاصل ہو جائے اور محبت کا وہ پاک چشمہ جو خاشاک علائق دنیوی سے دب گیا تھا پھر فوارہ کی طرح اسی بلندی پہ چلا جائے۔"

(جلد دوم صفحہ ۴۱۸)

لیکن اس کوشش کے باوجود سیرت کے ان محبوب پہلوؤں پر اتنا زیادہ زور نہیں دیا جو لوگوں کو رسول ہاشمیؐ کا گرویدہ بنا دیتے ہیں۔ بلکہ تاریخی حقائق ہی پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس میں ایک نقشہ بھی شامل کیا ہے۔ جس میں سنین ہجری کے واقعات دوسرے سنین

وایام کے مطابق دکھائے گئے ہیں۔

تیسری جلد میں مناظرانہ رنگ زیادہ نمایاں ہے قاضی صاحب انجیل پر زبردست عبور رکھتے ہیں۔ اور دوسری کتب الہٰیہ سے بخوبی واقف ہیں ان کے بیانات کی روشنی اور دوسرے مذاہب اور انبیاء کے اقوال وبیانات سے نبوت اور اسلام کی صداقت کی گواہی اور ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔

قاضی صاحب بحیثیت سوانح نگار اتنے اہم اور بلند نہیں ہیں جتنا ایک مورخ اور مناظر کی حیثیت سے ان کا لب ولہجہ مناظر ہونے کے باوجود بہت سلجھا ہوا اور شائستہ ہے اور ایک سچے مسلمان کی طرح ان کے قلم سے کسی نبی آسمانی کتاب یا مذہب کی توہین یا دل آزاری نہیں ہوئی قاضی سلیمان پر آکر عہد سرسید کے سوانح نگاروں کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور ہمیں ان سوانح نگاروں کی بعض فنی خامیوں کے باوجود اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان حضرات نے اپنی قلمی کاوشوں سے اردو کے سوانحی سرمائے میں اچھا خاصا اضافہ کیا ہے۔

——— ۰:۰:۰ ———

چھٹا باب

اردو سوانح نگاری حالی و شبلی کے بعد

گزشتہ ابواب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ اردو میں سوانح نگاری باقاعدہ اور مستقل فنی حیثیت سے "حیات سعدی" کی تصنیف کے بعد ہی متعارف ہوئی ہے۔ لیکن اس صنف ادب پر ابتدا ہی سے کسی نہ کسی صورت میں قلم اٹھایا جاتا رہا ہے۔ بیشتر اہل قلم حضرات نے اپنی دوسری قلمی کاوشوں کے ساتھ ہی توشۂ عاقبت کے طور پر انبیاء اور دوسرے بزرگان دین کے فضائل اور مناقب قلم بند کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے سرمایہ ادب کا کثیر حصہ کتب تذکرہ، سیرت و سوانح پر مشتمل ہے۔ جس کا پورا احاطہ کرنا بڑا صبر آزما اور دقت طلب کام ہے۔

بہرحال فن سوانح نگاری مختلف مدارج اور منازل طے کرتا ہوا بیسویں صدی میں داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن ابھی تک یہی محسوس

ہوتا ہے کہ یہ اہم فن جس کو ہماری زبان میں بھی اہم ہی کہا گیا ہے بعض افادیت پسند ہاتھوں میں ایک آلہ کا بن کر رہ گیا۔ کبھی تو اس کو لکھ کر مصنف زاد آخرت کی غرض سے اور کبھی مختلف قومی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اس کو کام لایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جدید زمانے میں بھی جبکہ ہماری دوسری اصناف ادب جدید تصورات سے نہ صرف روشناس ہو چکی ہیں۔ بلکہ ان کو بڑی حد سے زیادہ انہی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اردو سوانح نگاری نے ابھی تک خود کو جدید تقاضوں کے مطابق نہیں بنایا اور ہم اردو کی بعض اہم اور قابل ذکر سوانح عمریوں میں وہی انداز اور رنگ پاتے ہیں۔ جو انگریزی سوانح عمریوں کا اٹھارہویں صدی کا آغاز بس تھا۔

لیکن اس بنا پر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اردو سوانح نگاری جدید تقاضوں اور تصورات سے کلیتہً عاری ہے موجودہ صدی نے ہماری زبان میں سوانح نگاری کے بعض اچھے نمونے بھی پیش کئے ہیں اس صدی میں فن سوانح کے طالب علم کو سوانح نگاری کے دو بڑے دبستان نظر آتے ہیں ایک وہ فریق جس نے اپنی سوانح نگاری کی بنیاد جذبات اور خاص مقاصد پر رکھی تھی اور دوسرا وہ گروہ جو سوانح نگاری کو شخصیت کا مطالعہ اور کردار کا آئینہ بنانا چاہتا ہے اور جس نے اپنی سوانح نگاری کی بنا زیادہ حقیقت پسندانہ نظریہ کے ساتھ رکھی ہے۔

یہ جذباتی اور افادی نظریہ رکھنے والے سوانح نگار وہ ہیں جو

سلسلہ دارالمصنفین سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جن کے پیش نظر مولانا
شبلی کی تصانیف سوانح کا نمونہ ہے۔ اس دبستان یا جماعت کے قابل
ذکر مصنفین سید سلیمان ندوی عبدالسلام ندوی۔ حبیب الرحمٰن خان
شیروانی اکرام اللہ ندوی۔ سعید انصاری۔ شاہ معین الدین وغیرہ ہیں
جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اس اسکول کے مصنفین کا زاویہ
نظر مقصد اور طریق کار وہی ہے۔ جو خود مولانا شبلی کا تھا۔ یہاں پر مولانا
شبلی کا نظریہ دہرا دینا بے جا نہیں معلوم ہوتا۔ شبلی مغرب کے تصور
سوانح سے آشنا تھے۔ اور اس میں بھی کارلائل کے مداح اور اس کے
نظریۂ فن سے زیادہ متاثر تھے۔ اس کی کتاب "Theory of
Greatmen" کے مداح تھے اس کی "Heroes
& Heroworship" سے انھوں نے استفادہ بھی کیا ہے
اور اسی لئے انھوں نے اپنے تصنیفی پروگرام میں سلسلۂ ناموران روایاتِ
اسلام کو جگہ دی اور وہ ان کی تصانیف کا گراں قدر حصہ ہے۔ انھوں
نے اپنی مشہور کتاب سیرت النبیؐ کی بنا رکھی مغربی اصول سوانح ہی پہ
رکھی تھی وہ تحقیق و تفتیش کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اس کے باوجود ان
تصانیف اور تحریر میں جذبات کو بڑا دخل تھا۔ اگر یہ منظر سے دیکھا
جائے تو اس سلسلہ اور پروگرام کی بنا ہی جذبات پر رکھی گئی تھی یعنی
خود اپنے جذبہ کی تسکین اور اسلاف کے کارناموں سے بے پروا اور
بے حس قوم میں جذبات انگیزی مقصود تھی۔ چنانچہ دارالمصنفین اور اس

سلسلے کے لکھنے والے کم و بیش انہی خصوصیات سے متصف تھے۔

اس گروہ کے سرخیل سید سلیمان ندوی مولانا شبلی کے عزیز ترین شاگرد ہیں قطع نظر سوانح نگاری کے موصوف نے علمی ادبی لسانی اور سیاسی موضوعات پر بھی تصانیف کی ہیں۔ آپ کا اردو کے مشہور اور بڑے انشار پردازوں میں شمار ہوتا ہے۔ آپ کی تحریر و اسلوب اپنا انفرادی رنگ رکھنے کے باوجود شبلی سے متاثر معلوم ہوتا ہے اور ان کی عبارتیں اکثر استاد و شاگرد کی طبعی مناسبت کی غمازی کرتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں بھی شبلی کی سی مبالغہ آمیزی اور جذبات انگیزی ملتی ہے مثلاً حیات شبلی کی ایک عبارت ہے۔

"سلطان محمود نے ہندوستان کی سرزمین کو اسلام کے نعروں سے پرشور کر دیا اور غزنی سے لے کر پنجاب تک یک لخت اسلام کی حکومت قائم کر دی۔"

(صفحہ ۱ حیات شبلی)

"ہندوستان کی سرزمین کو اسلام کے نعروں سے پرشور کر دیا اور یک لخت اسلام کی حکومت قائم کر دی۔" اس قسم کے فقرات ہیں جن میں واقفیت کے باوجود مبالغہ موجود ہے اور یہ جملہ مولانا شبلی کے اس جملہ کی طرح ہے۔

"اسلام ایک ابر کرم تھا جو سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا لیکن بقدر استعداد فیض پہنچا۔ جس خاک میں جس

قدر قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیض یاب ہوئی۔"

لطف یہ ہے کہ اپنے استاد کے اسی اقتباس سے سید صاحب نے مذکورہ عبارت والے باب کا آغاز کیا ہے اور بظاہر سرسری نظر ڈالنے سے عبارت اور اسلوب کا ذکر اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سے سید صاحب کے انداز سوانح نگاری کی خود بخود تشریح اور وضاحت ہو جاتی ہے اور بحیثیت تاریخ وسوانح نگار ان کے اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طرز اور اسلوب ایک حقیقت نگار سوانح نگار کا اسلوب نہیں۔ ایک مورخ کی طرح سوانح نگار کو بھی حقیقت پر نظر رکھنی چاہیے اس کے الفاظ بھی مصور کے موقلم کی طرح محتاط اور سنبھلے ہوئے ہونا چاہئیں تاکہ وہ صحیح مرقع تیار کر سکے اور تصویر میں رنگ بھرتے وقت صحیح خدوخال نمایاں ہوں نہ نقش اتنے موہوم اور پھیکے ہوں کہ شکل نظر نہ آئے۔ نہ اتنے شوخ اور گہرے ہوں کہ اصلی خدوخال دب جائیں۔ لیکن سید صاحب کا طرز بھی اس احتیاط کا قائل نہیں معلوم ہوتا۔ اس طرح یہ امر معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب خالصتاً ایک سوانح نگار کا مزاج نہیں رکھتے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سوانح نگاری سے بلحاظ فن واقف ہیں اور یہی سبب ہے کہ انھوں نے ایک سوانح نگار کا مزاج نہ رکھتے ہوئے بھی اہم اور قابل قدر سوانح عمریاں تصنیف کی ہیں۔ ان کی مشہور سوانحی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) رحمت عالم (۲) حیات امام مالک رح (۳) سیرت عائشہ رضہ
(۴) حیات شبلی۔ (۵) سیرت النبی میں شریک تھے۔ (۶) خیام

رحمت عالم سیرت النبی صلعم پر مختصر کتاب ہے جو بچوں کے لئے لکھی ہے اور اس میں چند امور کا خاص لحاظ رکھا ہے اس کا ذکر خود کرتے ہیں۔

"ایک زمانے سے دوستوں کا اصرار تھا کہ چھوٹے لڑکوں اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لئے سیرت کی ایک ایسی چھوٹی سی کتاب لکھوں جس کا پڑھنا اور سمجھنا سب کے لئے آسان ہو پھر اس میں کوئی اہم بات چھوٹنے بھی نہ پائے۔"

(رحمت عالم صفحہ ۱)

یعنی یہ آسان بھی ہو اور جامع بھی ساتھ ہی عبارت کی سادگی اور طرز ادا اور واقعات کے سلجھاؤ کا خاص خیال رکھا جائے اور یہ واقعہ ہے کہ اس کی عبارت سادہ اور دل نشین ہے۔ کتاب کی دلچسپی اور اثر کا بڑا لحاظ رکھا ہے رسول اکرم کی ہجرت اور مدینہ میں داخلے کے موقع کو بڑی جزئیاتی تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کی دلکشی میں اس وجہ سے بھی اضافہ ہو گیا ہے کہ آپ کو ہجرت سے پہلے مکہ میں جن مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور پھر اس بے بسی اور بے کسی اور اہانت آمیز سلوک کو بھی بالتفصیل بیان کیا ہے اور پھر اہل مدینہ کے پُرخلوص۔ عقیدت مندانہ اور پرجوش استقبال کا اس طرح ذکر کر کے تقابل کے ذریعہ بڑا

خوشگوار اثر ڈالا ہے اور قاری کو ایک خاص مسرت اور تسکین بخشی ہے۔ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

آپ کے ننھیال رشتہ دار بنو نجار ہتھیار لگا کر آپ کو لینے آئے قبا سے شہر مدینہ تک ہر قبیلہ کے معزز لوگ دور و یہ کھڑے تھے۔ آپ جس قبیلہ کے آگے سے گزرتے وہ عرض کرتا کہ اے خدا کے رسول یہ گھر یہ مال یہ جان حاضر ہے۔ آپ شکریہ ادا کرتے دعائے خیر دیتے۔ شہر قریب آیا تو مسلمانوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ عورتیں چھتوں پر نکل آئیں اور گانے لگیں۔" (رحمت عالم صفحہ ۴۸)

اس قسم کے خوشگوار مسرت اور تسکین کے ایک اور موقع سے فائدہ اٹھایا ہے ایک ایسا شخص جو دنیا میں ایک خاص پیام اور مشن لیکر آیا ہوا ہے مشن کی انتہائی منزل کو دیکھ کر خصوصاً اس وقت جبکہ خود اس کی کشتی حیات کنارے سے آلگی ہو ابدی سکون اور مسرت محسوس کرتا ہے ایسے وقت میں اپنے مشن کی تکمیل کا نظارہ ہی حاصل حیات ہوتا ہے۔ اپنے صاحب سوانح کے جذبہ کو سید صاحب نے فراموش نہیں کیا ہے بلکہ خود بھی اس سے محظوظ ہوئے ہیں اس موقع کا جب آں حضرت نے اپنی وفات کے دن کچھ افاقہ محسوس کیا اور نماز فجر کا نظارہ کرنے کے لئے حجرہ کا پردہ ہٹا کر دیکھا تو بے حد مسرور ہو گئے ہیں۔ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

آپ نے صبح کے وقت پردہ اٹھا کر دیکھا تو لوگ فجر کی نماز میں مشغول تھے دیکھ کر مسکرا دیئے کہ خدا کی زمین پر آفرودہ

گروہ پیدا ہو گیا۔ جو رسولؐ کی تعلیم کا نمونہ بن کر خدا کی یاد میں لگا ہے۔"

(رحمت عالم صفحہ ۱۴۸)

موضوع سیرت ایک ایسا موضوع ہے جس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا ہے۔ اس کے متعلق مواد اور معلومات کا لا انتہا ذخیرہ موجود ہے مصنف نے اس میں سے بڑے سلیقہ اور ہنر مندی سے انتخاب کیا ہے۔ اس طرح کہ تمام اہم اور جذباتی واقعات بھی آگئے اور کتاب میں بے جا تفصیل اور طوالت بھی نہیں پیدا ہوئی بجائے اس کے کہ کم سن یا نو آموز قاری اکتا جائے اس کی دلچسپی برابر قائم رہتی ہے۔ واقعات کا حسن انتخاب اس کتاب کی خوبی ہے۔

حیات امام مالک اس سوانح عمری کے لکھنے کی ضرورت مصنف نے اس خاص مقصد اور سبب کے پیش نظر محسوس نہیں کی جس نے برسوں ان کے استاد مولانا شبلی کو مضطرب اور بے چین رکھا تھا۔ یعنی قدیم و جدید کی آویزش نئے تعلیم یافتہ طبقے میں اسلامی علوم سے بے اعتنائی اور سرد مہری جیسا کہ خود لکھتے ہیں۔

"آج کل ملک میں اسلامی علوم کی طرف سے سرد مہری اور بے اعتنائی برتی جا رہی ہے۔ اور جو انگریزی تعلیم کی

وسعت کے ساتھ ترقی کرتی جاتی ہے۔ اس کی روک تھام کے لیے مصلحین کے سامنے مختلف صورتیں پیش ہیں منجملہ ان کے ایک صورت یہ ہے کہ ملک میں تاریخ کا مذاق کسی قدر پیدا ہو گیا ہے۔ اکابر اسلام کی سوانح عمریوں کے پردے میں علوم اسلامیہ کی تاریخ لکھی جائے اور اسی ضمن میں ضروری مسائل کی تشریح کی جائے ؎۔

(دیباچہ حیات امام مالک صفحہ ۱)

اسی طرح یہ بات صاف ہو گئی کہ مصنف کا مقصود اصلی امام مالک کی سوانح عمری کے پردے میں علوم اسلامیہ کی تاریخ اور مسائل کی تشریح تھی اس طرح انھوں نے ان کی سوانح عمری کو آلۂ کار بنایا۔ امام صاحب کے نسب ولادت اور خاندان کا مختصر حال لکھتے ہی تعلیم و تربیت کا ذکر شروع کر دیا ہے۔ نہ تو بچپن کے کسی واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اور نہ ہی اس امر کی وضاحت کی ہے۔ کہ آیا یہ حصہ دیدہ و دانستہ نظر انداز کیا ہے یا اس بارے میں فقدان معلومات اور ساطاعات کی بنا پر خاموشی اختیار کی ہے بہر حال تعلیم کا ذکر آتے ہی اپنے مقصود اصلی اور مشن کی تکمیل میں مصروف ہو گئے ہیں علم فقہ کے متعلق معلومات بہم پہنچانے لگے ہیں۔ فقہائے مدینہ اور شیوخ و تابعین کی فہرست اور ذکر پیش کرنے کے بعد مستند اور بلند پایہ علماء کا ذکر اور علمی پایہ بیان کیا ہے اپنی اس تصنیف میں سید صاحب مولانا شبلی سے بلحاظ فن بہت

زیادہ متاثر اور قریب نظر آتے ہیں یہی انداز اور طریق کار جو سیرت النعمان اور غزالی میں بڑے پیمانے پر ملتا ہے۔

امام صاحب کے اجتہاد میں علمی فضیلت، احتیاط اور درس کے حالات بھی بیان کئے ہیں

چونکہ مصنف کے پیش نظر اسلام کے اس زبردست عالم اور آزاد رو فقیہہ کا علمی پہلو تھا اسی لئے اس کو بہت اچھی طرح پیش کیا ہے۔ امام مالک کے علم و فضل کے علاوہ اس زمانے کے شیوخ کے طریق درس کا نقشہ اس انداز میں پیش کیا ہے کہ اس وقت کی درس گاہوں کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

"مختلف شیوخ کی مجالس میں درس کا طرز مختلف تھا اکثر شیوخ کا دستور یہ تھا کہ وہ خود کسی بلند مقام پر بیٹھ جاتے یا کھڑے ہو جاتے طلباء بہ ترتیب پس و پیش قلم دوات لے کر بیٹھ جاتے شیخ زبانی یا اپنا جزو حدیث ہاتھ میں لے کر املا کراتا تھا طلباء لکھتے جاتے اگر غیر معمولی اجتماع ہوتے تو تھوڑی تھوڑی دور پر مستملی کھڑے ہوتے تھے جو شیخ کے الفاظ بعینہ آگے کو پہنچاتے امام مالک بھی کبھی کبھی اس طریقہ سے درس دیتے تھے"

(حیات امام مالک صفحہ ۴۳)

پھر خاص امام صاحب کی مجلس درس میں طلباء کی مودب

نشست وسکوت کا حال بھی اس طرح لکھا ہے کہ ایک طرف تو طلبار کے ذوق وشوق کا اندازہ ہوتا ہے دوسری طرف امام صاحب کے رعب وزخار کا اندازہ ہوتا ہے۔

"تمام لوگ سرنگوں خاموش مودب بیٹھے تھے۔ یہاں تک کہ امام ابوحنیفہ بھی جب امام کی مجلس میں آکر شریک درس ہوتے تو وہ بھی اسی طرح مودب ہو کر بیٹھتے تمام مجلس پر ایک مقدس سکوت طاری رہتا تھا۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ کتاب کے ورق بھی اس ڈر سے نہیں الٹتے تھے کہ کھڑکھڑاہٹ کی آواز نہ ہو۔"

علمی پہلو کے علاوہ سیرت کے چند پہلو اور بھی پیش کئے ہیں مثلاً امام صاحب بڑے نفاست پسند تھے ان کی نشست گاہ کی زیب و زینت خوشبوؤں اور بخورات کا اور اسی طرح ان کے لباس کی پاکیزگی اور نفاست کا خصوصیت اور تفصیل سے ذکر کر کے ان کے شستہ اور اعلیٰ مذاق کا ثبوت دیا ہے۔

امام صاحب اسلامی مساوات جرأت و بے باکی کا نمونہ تھے وہ مہدی اور ہارون الرشید جیسے بادشاہوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے نہ کبھی ان کی خاطر اپنے اصول توڑتے اور نہ ان کے روبرو حق بات کہنے سے چوکتے ان کی یہ ادا ہمارے مصنف کو بھائی ہے اور اس کا ذکر متعدد واقعات کے ضمن میں بیان کیا ہے۔

یہ ایک باوقار سنجیدہ اور خاموش طبع عالم کی سوانح عمری ہے اور مصنف نے بھی اس کو متانت اور سنجیدگی سے ہی پیش کیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ان کا قلم شعریت اور مصوری کی طرف مائل نظر آتا ہے۔

جاہ و جلال اور شان و شکوہ سے کاشانہ "امامت پر بارگاہ شاہی کا دھوکہ ہوتا تھا۔ طلبار کا ہجوم مستفیدوں کا اژدحام امرار کا ورود علمار کی تشریف آوری بیباحوں کا گزر حاضرین کی مووب نشست درخانہ پر سواریوں کا انبوہ دیکھنے والوں پر رعب و وقار طاری کر دیتا تھا"

(صفحہ ۲۳ حیات امام مالک)

امام صاحب کی وفات کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں

"گریہ جاری تھا لب متحرک تھے کہ مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ اب بھی اسی طرح طلبار کا ہجوم تھا۔ لیکن صدر نشین بزم اب حیات جاوید کے بستر پر آرام کر رہا تھا۔"

(صفحہ ۷۰ حیات امام مالک)

ان عبارتوں پر یہی دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ مولانا شبلی ہی کے قلم سے نکلی ہیں۔ ان کی ایک چیز اور بھی شبلی سے مماثلت رکھتی ہے یعنی اپنی شخصیت اور آواز کو نمایاں کرنا۔ مولانا شبلی کی طرح سید صاحب بھی کبھی کبھی ماضی کا مقابلہ حال سے کر کے اپنی آواز کو بلند کرتے ہیں۔

"آج علمار کا بخل و افلاس دیکھ کر کون نتیجہ نکال سکتا ہے کہ علمائے سلف کی فیاضیاں شاہانہ فیاضیوں سے کم نہ تھیں۔"

(حیات امام مالک صفحہ ۸۷)

تصانیف پر خصوصاً "موطا" پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے

فن سوانح نگاری کے نقاد ان سے مطالبہ کر سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ہیرو کے شخصی اور نجی حالات و واقعات کو اندھیرے میں رکھا ہے اور مطلقاً پیش نہیں کیا لیکن اس بارے میں اتنے سخت محاسبہ کی زیادہ ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ اول تو مصنف نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ خالصتہً سوانح عمری لکھ رہے ہیں۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ اوائل اسلام کے علمار اپنے علم کی تحصیل و تدریس میں اس درجہ منہمک رہے ہیں کہ انھوں نے خود اپنی شخصی اور نجی زندگی کو زیادہ سے زیادہ مختصر کر دیا تھا جہاد نفس ہی ان کی پہلی اور آخری منزل ہوتی تھیں اور جو شخص ہر وقت اپنے نفس اور خواہشات کے محاسبہ اور تربیت میں مصروف ہوا اس کی ظاہری زندگی میں کم سے کم کمزوریاں نظر آنا یقینی امر ہے اور کوئی تعجب نہیں جو ایسے اشخاص کا سوانح نگار ان کی بشری کمزوریاں دکھانے سے قاصر رہ جائے۔ اس کے علاوہ مشرق کے سوانح نگار سے یہ توقع کرنا بھی عبث ہے کہ وہ اپنے یہاں کے اس تصور سے قطعی بیگانہ ہو جائے کہ ع۔

(خطائے بزرگاں گرفتن خطا است)

اور مغرب کے بعض ملامت پسندوں کی طرح ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر عیب وخطا کے مرقعے پیش کرنے کی کوشش کرے۔

سیرت عائشہ رض سید سلیمان ندوی کی اس تصنیف سے پہلے اوائل اسلام کی کسی خاتون کی مختصر مستقل سوانح عمری نہیں لکھی گئی تھی اور اس طرف سب سے پہلے موصوف ہی نے توجہ کی ہے۔ یہ سوانح عمری نہ صرف اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ امت مسلمہ کی قابل صد احترام ماں کی پہلی سوانح عمری ہے جس میں ایک عورت کی زندگی اور فطرت کے بوقلموں اور گوناگوں پہلو پیش کئے گئے ہیں۔ اور عورت ایک بیٹی بیوی بہن سوتیلی ماں عالمہ فاضلہ مجاہدہ قابل احترام اور ہردلعزیز ہستی کے روپ میں نظر آتی ہے

مصنف کا خیال ہے کہ یہ اتنا جامع اور ہمہ گیر موضوع ہے کہ اس کے کسی نہ کسی پہلو سے عورت فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

"ایک مسلمان عورت کے لئے سیرت عائشہ رض میں اس کی زندگی کے تمام تغیرات اور انقلابات، مصائب۔ شادی رخصتی سسرال۔ شوہر۔ سوکن۔ لاولدی۔ بیوگی۔ غربت رشک وحد غرض ہر موقع اور ہر حالت کے لئے قابل تقلید واقعات موجود ہیں۔ علمی عملی اخلاقی ہر قسم کے گوہر گراں مایہ سے یہ پاک زندگی مالا مال ہے۔ اس لئے سیرت عائشہ رض اس

کے لئے آئینہ خانہ ہے۔

(دیباچہ صفحہ ۲ سیرت عائشہ رضہ)

اگرچہ کتاب کا ماخذ کتب احادیث ہیں اور وہی مقررہ اور جانے بوجھے واقعات ہیں جو بار بار ملتے ہیں۔ لیکن مصنف نے بڑی خوبی اور احتیاط سے واقعات کو پیش کیا ہے۔ حضرت عائشہ رض کی سیرت کے تمام پہلوؤں علم فضل، مذاق، شعر و سخن فقہ و حدیث کے علم میں احتیاط معززی اور نکتہ سنجی کو بالترتیب واقعات کی مدد سے پیش کیا ہے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ کوشش یہ کی ہے کہ ان کی فطرت کے تمام تر بشری پہلوؤں کو پیش کرنے میں کوتاہی نہ ہو اور اس سلسلہ میں ان کو معلومات کے جو مواقع ملے ہیں۔ ان کو بڑی اچھی طرح استعمال کیا ہے حضرت عائشہ رض کو چھ سال کی عمر ہی سے اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ شرقی تذکرہ اور سوانح نگاری میں وہ پہلی شخصیت ہیں جس کے بچپن کے ہر واقعہ کو محفوظ کر لیا گیا ہے اور جس کے عہد طفلی کی جزئیاتی تفاصیل موجود ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے بچپن کے معصوم مشاغل کھیل کود اور کھلونوں تک کی تفصیل ملتی ہے۔ یہ مصنف کا ذاتی انتخاب اور رجحان ہے کہ جہاں تک انھوں نے حضرت عائشہ رضا کے بچپن کے ان واقعات کا انتخاب کیا ہے جو ان کی غیر معمولی شخصیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہاں ان کی بشری خصوصیات اور معصوم طفلانہ باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور بعض وقت وہ ایک چھوٹی سی معصوم بچی کے سوا کچھ نہیں نظر آتیں

ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

"حضرت عائشہ کم سن بچی تھیں کبھی کبھی بچپن کے تقاضہ سے ماں کی مرضی کے خلاف کوئی بات کر بیٹھیں تو ماں سزا دیتی تھیں آں حضرت صلعم اس حال میں دیکھتے تو رنج ہوتا اس بنا پر ام رومان سے تاکید کر دی تھی کہ ذرا میری خاطر سے ان کو ستانا نہیں ۔ ایک بار آپ حضرت ابوبکرؓ کے گھر تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت عائشہؓ کواڑ سے لگ کر رو رہی ہیں آپ نے ام رومان سے کہا میری بات کا لحاظ نہیں کیا انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ میری بات باپ سے جا کر لگا آتی ہے آپ نے فرمایا یہ کچھ بھی کرے ۔ لیکن اس کو ستاؤ نہیں ۔"

مشرق کی لڑکی خواہ کتنی ہی ذمہ دار بلند مرتبت اور ذی فہم کیوں نہ ہو جائے وہ ہمیشہ اپنے باپ کا لحاظ کرتی اور اس سے ڈرتی رہتی ہے ۔ چنانچہ مشرق کی یہ عظیم المرتبت بیٹی بھی ہمیشہ اپنے باپ کا احترام ہی نہیں کرتی رہی بلکہ ان سے ڈرتی بھی تھی ۔ اس قسم کے واقعات کا ذکر مختلف مواقع پر کیا ہے ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

"حضرت عائشہؓ شادی کے بعد بھی اپنی لغزشوں پر باپ سے ڈرا کرتی تھیں ۔ کئی موقعوں پر حضرت ابوبکرؓ نے ان کو سخت تنبیہہ کی ایک دفعہ آنحضرت صلعم کے سامنے

یہ موقع آیا تو آپ نے ان کو بچا لیا۔" سیرت عائشہؓ صفحہ

حضرت عائشہؓ کی قیادت میں جنگ جمل کا لڑا جانا اسلئے باعث حیرت نہیں تھا کہ مصنف انکی سیرت کے اس پہلو پر پہلے بھی روشنی ڈال چکا تھا کہ آپ بڑی جری دلیر اور باعمل فہم کی عورت تھیں چنانچہ جنگ جمل کے اسباب و علل بیان کرتے وقت جہاں یہ بتایا ہے کہ اس جنگ میں غلط فہمیوں اور سازشوں کا ہاتھ زیادہ تھا اور طرفین میں باہمی کوئی مخاصمت یا دشمنی نہ تھی وہاں ان کی سیرت کے اس پہلو کو بھی اس جنگ کا ایک سبب بتایا ہے۔

"حضرت عائشہؓ فطرۃً نہایت بلند حوصلہ جری اور پُردل تھیں آنحضرت صلعم سے انھوں نے اجازت چاہی تھی کہ وہ جہاد میں شریک ہوا کریں۔"

(صفحہ ۱۴۱)

اس کے علاوہ آنحضرتؐ کے سامنے غزوات میں اور جنگوں میں برابر دلچسپی لیتی تھیں اور کسی نہ کسی طرح شریک رہتی تھیں چنانچہ ان کی فطرت کے اس پہلو کو اس جنگ کا بڑا سبب ٹھہرایا ہے۔

عورتوں کی فطرت میں ناز اور خودداری کا مادہ ہوتا ہے اور سید صاحب نے حضرت عائشہؓ کی سیرت کا یہ پہلو بھی پیش کیا ہے

"باایں ہمہ عجز و انکساری نہایت خوددار تھیں واقعہ افک کے موقع پر جب آنحضرت صلعم نے برأت کی آیتیں پڑھ کر سنائیں اور ماں نے کہا اپنی شوہر کا شکریہ ادا

کہو۔ بولیں میں صرف اپنے پروردگار کا شکر ادا کروں گی جس نے مجھ کو پاک دامنی و طہارت بخشی ہے۔"

(صفحہ ۱۸۷ سیرت عائشہؓ)

"آں حضرت صلعم سے خفا ہوتیں تو آپ کا نام لے کر قسم کھانا چھوڑ دیتیں۔"

(صفحہ ۱۸۷)

عورتوں کی فطرت ہوتی ہے کہ آپس کے تعلقات میں ان میں بڑی جلدی رنجشیں اور شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں خصوصاً ایسے حالات میں جب وہ ایک دوسری کو اپنی زندگی میں برابر کا شریک پاتی ہیں تو یہ کبیدگیاں اور کشیدگیاں دوچند اور سہ چند ہو جاتی ہیں۔

حضرت عائشہ بھی ایک عورت کی فطرت رکھتی تھیں بہر حال ان کو بھی دوسری امہات المومنین سے رنجشیں اور شکایتیں بھی ہو جاتی تھیں اور باوجود آں حضرتؐ کی ہر وقت محبت و سلوک اور خطا پوشی کی تلقین اور تعلیم کے اکثر تلخیاں بھی پیدا ہو جاتی تھیں اور جلد ہی بڑی سادگی سے صفائی بھی ہو جاتی تھی۔ سید صاحب نے اس کا ذکر بھی بڑے غیر جانب دارانہ طریقے سے کیا ہے۔ لیکن ان کے تحریر یا اظہار خیال میں نذیر احمد کی سی بے باکی اور بے راہ روی نہیں ہے۔ جس نے ان امہات الامۃ کو ان کے پایہ سے گرا دیا ہے۔

سیرت عائشہ رض کے مطالعہ کے بعد اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سید سلیمان ندوی نہ صرف فن سوانح نگاری سے بخوبی واقف ہیں۔ بلکہ اس کا احترام بھی حتی الامکان کرتے ہیں۔ اور یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ان کی نظر میں حضرت عائشہ رض کا جو مقام اور مرتبہ ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ بہت کم سوانح نگار اس امتحان میں پورے اترتے ہیں جس ورجہ واجب الاحترام ماں کی تمام بشری خصوصیات سے یہاں تک کہ کمزوریاں بھی غیر جانب داری اور دیانت داری سے پیش کر دی ہیں

حیات شبلی سید سلیمان ندوی کی مشہور ترین سوانحی تصنیف حیات شبلی ہے تنقید اور سوانح کی دنیا میں موصوف اپنی اسی تصنیف کی وجہ سے متعارف اور مشہور ہیں۔ ان کی اس تصنیف کے بارے میں اکرام صاحب کی رائے ہے۔

"سید سلیمان نے حیات شبلی لکھ کر حالی سے وہ تاج
تصنیفات چھین لیا ہے جو حیات جاوید کی بدولت اس
کے سر پہ تھا۔"

(شبلی نامہ صفحہ)

دراصل حیات جاوید اور حیات شبلی میں چند باتیں مشترک ہیں ہر دو تصنیفات نہ صرف مصنفین کے معاصرین کے سوانح حیات پر مشتمل ہیں بلکہ مصنفین کو اپنے اشخاص سوانح سے گہرا لگاؤ بڑا انس اور انتہائی عقیدت تھی وہ ان کو اپنے وقت کے بہترین اور مکمل نمین

انسان سمجھتے تھے اور ان کے افعال و حرکات کے خلوص صداقت اور اہمیت سے اسی قدر واقف تھے۔ جتنا کہ وہ لوگ خود واقف ہوں گے۔ حیات جاوید اور حیات شبلی کے مصنفین اپنے صاحب سوانح کی آنکھوں سے دیکھتے انہی کے کانوں سے سنتے اور انہی کی زبان سے بولتے ہیں دونوں اپنے اپنے اشخاص سوانح سے اس درجہ قریب اور متعلق رہے ہیں کہ ان کے متعلق ان کے ذخیرۂ معلومات میں اطلاعات اور مواد کا لامحدود سرمایہ موجود ہے۔ اور جب اس قدر اور بکثرت مواد اور معلومات موجود ہوں تو ان کا انتخاب اور ترتیب اس درجہ مشکل ہوتی ہے کہ لٹن اسٹریچی کا مقولہ ہے۔

"عہد وکٹوریہ کی تاریخ کبھی نہیں لکھی جائے گی کیونکہ ہم اس کے بارے میں بہت زیادہ جانتے ہیں۔"

اسی طرح ایک دوسرے نقاد کا قول ہے کہ۔

"کوئی بیٹا یا بیٹی اپنے ماں باپ کے متعلق آزادانہ نہیں لکھ سکتا جس قدر زیادہ قرابت داری ہو گی فیصلہ اسی قدر نا قابل اعتبار ہو گا۔"

سید سلیمان ندوی کے لئے یہ کام اس لئے اور بھی زیادہ مشکل ہو گیا کہ وہ اپنے استاد کی سوانح عمری لکھ رہے تھے جس میں قرب کے علاوہ احترام اور عقیدت بھی شامل ہے۔ ان کے امور کے علاوہ حیات جاوید اور حیات شبلی میں ایک اور قدر بھی مشترک

نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مولانا حالی اور سر سید صاحب دونوں کو اپنے موضوعات کے بارے میں قلم اٹھانے وقت اس امر کا اچھی طرح احساس تھا کہ ان کے موضوعات یعنی سر سید احمد شبلی نے اپنے خلوص جوشش عمل اور مشن کی تکمیل کی دھن میں مخالفین اور معترضین کی بڑی تعداد پیدا کرلی ہے اور دونوں مصنفین اپنے اپنے اشخاص سوانح کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیاں دور کرنا چاہتے تھے۔ ان مصنفین کا یہ جذبہ اور مقصد ہم کو سولہویں صدی کی انگریزی سوانح میں جارج کیونڈش کی سوانح نگاری کی یاد دلاتا ہے جو اس نے اپنے مرحوم آقا کارڈنیل وولزے کے بارے میں لکھی تھی وہ چار سال تک ہر وقت وولزے کی خدمت میں رہا یہاں تک کہ اس کے دم واپسیں پر بھی موجود تھا۔ جب دوسرے سوانح نگاروں نے وولزے کے حالات اور شخصیت کو مسخ طریقہ پر پیش کرنا شروع کیا تو اکتیس سال بعد اس نے قلم اٹھایا کہ وولزے کے بارے میں جو کچھ جانتا ہے پیش کر دے۔ اس نے اپنے مقدمہ میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ وہ وولزے کے خلاف پھیلائے ہوئے باطل دعوؤں کی تردید کرنا چاہتا ہے۔ Cavendish نے اپنی کتاب انگلش بیاگرافی میں ایس پیش لفظ کا بڑا حصہ نقل کر دیا ہے مختصراً کیونڈش کا یہی مدعا تھا کہ وہ اپنے آقا کے خلاف پھیلائے مسموم واقعات اور خیالات کا ازالہ کرے جس کی زندگی اس کی نظروں میں اعلیٰ بلند اور قابل قدر تھی۔

باوجود اس کے کہ کیونڈش نے وولنزے کی شخصیت کو نمایاں کرتے میں بڑی محنت سے کام لیا ہے اور بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے لیکن اس کی سوانح نگاری کو مخلصانہ اور سچی کہنے میں تامل کیا جاتا ہے اور اس پر چند اعتراضات بھی وارد کئے گئے ہیں۔

(۱) وولنزے کی شخصیت کی مکمل اور کامیاب مصوری کرنے سے قاصر رہا ہے۔

۲۔ مصنف وولنزے کی اخلاقی کیفیتوں اور اقتدار سے زیادہ متاثر ہے اس نے زیادہ تر اسی کا ذکر کیا اور ان کے نتائج بیان کئے ہیں۔

۳۔ اس کے بچپن کے حالات تاریکی میں رکھے ہیں۔

۴۔ کتاب کے آخر میں بھی اخلاقی نصیحت آموزی سے باز نہیں آیا

۵۔ ایک اہم اعتراض یہ بھی ہے کہ وہ وولنزے کی پیچیدہ طبیعت کو خاطر خواہ طور پر پیش کرتے میں ناکام رہتا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ اس کی فطرت کے بعض انوکھے پہلوؤں سے واقف تھا لیکن وہ اس کو پیش نہیں کرنے سے قاصر رہا۔ اور اس کا دلکش طرز بیان باوجود اپنے موضوع کو دلکش بنا کر پیش کرنے کے کیونڈش کو اچھا سوانح نگار نہ بنا سکا۔

ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ تقریباً اسی نوع کی سوانح نگاری حالی نے انیسویں صدی میں کی اور اسی قسم کے اعتراضات ان پر عاید کئے

گئے۔ اور پھر اس کے عرصہ دراز کے بعد جب سید سلیمان ندوی نے اسی قسم کی سوانح عمری لکھی تو ان کا فن بھی انہی عناصر کا حامل نظر آتا ہے اور ان پر بھی وہی اعتراضات وارد کئے جا سکتے ہیں۔ جو سولھویں صدی کے مغربی مصنف جارج کیونڈش پر کئے گئے تھے البتہ حالی کی طبعی سنجیدگی اور سوانح نگاری سے مناسبت نے ان کو فن سے زیادہ قریب رکھا ہے

سید صاحب اپنے استاد کے سچے اور صحیح جانشین کہے جانے کے مستحق ہیں۔ خصوصاً حیات شبلی میں ان کا تصور سوانح اور انداز تحریر مولانا شبلی ہی کے خیالات کا عکس ہے۔ اور اس میں انھوں نے بھی وہی طریق کار اختیار کیا ہے۔ جو مولانا شبلی کا تھا یعنی اس سیاسی سماجی اور تاریخی پس منظر کے ذریعہ صاحب سوانح کے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جس میں اس کی سیرت و کردار کی تشکیل ہوئی ہو۔

حیات شبلی میں سید صاحب نے محض وقتی ماحول اور حالات پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس دور دراز تاریخی اور سیاسی پس منظر کا جائزہ لیا ہے جس نے رفتہ رفتہ زمانے کو ان حالات اور منازل تک پہنچایا جس میں شبلی نے آنکھ کھولی جس زمانے نے ان تقاضوں اور اقتدار کی تشکیل کی جن کو شبلی نے دیکھا سمجھا جانا اور اس سے مطابقت یا مخالفت کی چنانچہ مغلیہ دور آخر کا تمام سیاسی سماجی اور تاریخی پس منظر دیا ہے۔ پھر یہ بھی ثابت کیا ہے کہ شبلی وقت اور زمانے کی ضرورت کے عین مطابق پیدا ہوئے تھے۔ اور ان کا ہر قدم اسی ضرورت کے

لئے تھا ان کا کہنا ہے کہ زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے ایسے اشخاص پیدا ہوتے ہی رہے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے اپنے دین حنیف کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس وعدہ کا پورا ہونا یقینی امر ہے۔ لیکن اس کے یقینی ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اس کی یہ تدبیر بھی فرماتا ہے کہ ہر زمانے میں اس زمانے کی ضرورت کے مطابق ایسے اشخاص پیدا فرماتا ہے جو اس ضرورت کو پورا کر کے دین الٰہی کی حفاظت کا کام انجام دیتے ہیں۔"

(حیات شبلی صفحہ ۱۲)

متعدد علماء اور سیاسی رہنماؤں کے نام گنوانے کے بعد وہ اپنے ہیرو کا ذکر کرتے ہیں۔

"جب یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں کی تصنیفات کو پڑھ کر ان کے علوم کو سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علوم و تاریخ و تمدن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ان کے یہ اعتراضات بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سرایت کرنے لگے۔ اس دور میں اسلام کی خدمت کی سعادت جس کے حصہ میں آئی وہ ہمارے ان اوراق کا ہیرو تھے۔" (حیات شبلی)

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ ہمارا مصنف اپنے ہیرو کو عام انسانوں سے بلند ہی نہیں سمجھتا بلکہ ایک خاص مقصد کا حامل جانتا ہے اس کی۔ پوری زندگی پر اس کا فرض اور مقصد چھایا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ مامور من اللہ ہے چنانچہ قاری کو شروع ہی سے یہ توقع نہ رکھنا چاہیئے کہ مصنف ہیرو کا ایسا مرقع پیش کرے گا جس میں اس کی کمزوریاں خوبیاں اور عیب دوش بدوش نظر آئیں گی

سیاسی اور تاریخی پس منظر کے علاوہ سید صاحب نے اعظم گڑھ کے اطراف و جوانب کی مختصر سی تاریخ بھی لکھی ہے وہاں کے مدارس اور مشہور خاندانوں کی اہمیت اور علمی رجحانات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس طرح یہ دکھایا ہے کہ ان کے ہیرو نے قدیم علمی فضا میں ذہنی نشوونما پائی۔ جس کے پیچھے موروثی روایات و نسلی خصوصیات سب ہی کچھ موجود ہیں کتاب کے تین بڑے حصے ہیں معمولی حالات۔ کارنامے اور تصانیف عام عادات و خصائل اور حالات پہلے حصہ میں ان کے خاندانی حالات کے سلسلہ میں ان کے نسلاً راجپوت ہونے کا ذکر کرتے ہوئے ان کے جد اعلیٰ کے مسلمان ہونے کا دلچسپ واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ جس کو شبلی کے متعلق بعض لکھنے والوں خصوصاً اکرام صاحب نے "شبلی نامہ" میں بڑی اہمیت دی ہے۔ اور وہ شبلی کی زندگی کے بیشتر انقلابات اور واقعات کی نفسیاتی بنا ر شبلی کی زود اشتعال اور حساس فطرت کو بتاتے ہیں۔ جو ان کے جد اعلیٰ سے وراثتہً شبلی کو ملی تھی۔ ان کی زود حسّی

اثر پذیر طبیعت اور رقیق القلبی کا ذکر کئی موقعوں پر کیا ہے۔ جو عام طور پر ان کی فطرت کے اچھے پہلو ہی کو نمایاں کرتے ہیں۔ مثلاً اعظم گڑھ کے مدرسہ اسلامیہ کو ویران دیکھ کر ان کا دل بے قرار ہو گیا تھا اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

"مولانا مرحوم آخر عمر تک جب کبھی اعظم گڑھ آتے تو اکثر اس موقع پر تشریف لے جاتے اور تاثر کی جو کیفیت اس وقت مولانا پر ہوتی وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ زبان قلم اس کی صحیح مصوری سے عاجز ہے۔ ایک مرتبہ شام کا وقت تھا اور غالباً جنوری یا فروری کا مہینہ۔ سرسبز و شاداب کھیت لہلہا رہے تھے۔ بہار کا موسم تھا ولولہ انگیز موسم شام کا سہانا وقت کھیتوں کی طراوت بخش ہریاول ایک ایسا روح پرور سماں تھا کہ مغموم سے مغموم دل بھی تھوڑی دیر کے لئے باغ باغ ہو جاتا ہے۔ مگر مولانا ٹہلتے ٹہلتے دفعتاً ایک کھیت کی مینڈھ پر رک گئے۔ آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے۔"

(حیات شبلی صفحہ)

سید صاحب مولانا کے کارناموں کے علاوہ معمولی کاموں کو بھی بیان کرتے وقت اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ان کا فعل ناگزیر اور ان کا اقدام بجا تھا۔ چنانچہ وہابیوں کے خلاف ان کے جوش و خروش

اور مناظروں کے لئے یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ یہ قومی تفرقے کا باعث تھا اور اختلافات بڑھنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ۔

"ان کے سبب گویا یوں کہئے کہ خود مولانا شبلی کے خاندان میں آکر تفرقہ پڑ گیا تھا۔ غرض یہ اسباب تھے جن کی بنا پر مولانا شبلی نے مقلدین کی مدد کے لئے کمر ہمت چست باندھی۔"

(حیات شبلی صفحہ ۱۵۲)

اسی طرح سید صاحب اپنے ہیرو کی اہمیت ثابت کرتے رہتے ہیں اور ان کے ہر فعل کی اہمیت کو حق بجانب ٹھہراتے ہیں۔

مولانا شبلی کی زندگی کا ایک زبردست اور اہم واقعہ ان کا علی گڑھ سے الحاق اور وابستگی اور پھر اس کے بعد علیحدگی اور ترک تعلق ہے۔ ان دونوں واقعات نے دونوں مرتبہ ان کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور ان کی زندگی اور خیالات کے بہاؤ کا رخ یکسر بدل دیا حیات شبلی نامکمل رہ جاتی ہے اگر اس وابستگی کے بعد اس قطع تعلق کا اور اس کے اسباب کا ذکر نہ کیا جاتا۔ یہ جتنا اہم موقع ہے اتنا ہی اس کو پیش کرنا بھی مشکل ہے۔ یہی موقعے ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے ایک ذہین قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کے خیالات محسوسات اور قوت فیصلہ بیدار رہتی ہے۔ اور اس میں قوت شناخت اور

موازنے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور سوانح عمری کے بعض کرداروں کو اپنے محسوسات پر پرکھتا ہے۔ لیکن سید صاحب اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکے۔ انھوں نے بڑی توجہ اور محنت سے اپنے استاد کے اس اقدام کے جواز کے اسباب وعلل پیش کئے ہیں ان کو اس امر کا احساس نہیں رہا کہ جس انداز اور پیرائے میں وہ ان اسباب وعلل کو بیان کر رہے ہیں۔ وہ شبلی کے شاگرد رشید کا انداز تحریر سمجھ کر جانچا اور پرکھا نہیں جائے گا۔ شبلی کے سوانح نگاری میں بعض ایسے مواقع بھی ہوتے ہیں۔ جب لوگ اس فن سے بے تعلقی اور بے لاگی کا مطالبہ کر بیٹھتے ہیں جو ایک مورخ کے لئے ضروری ہے۔ بہر حال انھوں نے سر سید احمد خان کی ان بے اعتدالیوں اور قابل گرفت باتوں کو چن چن کر پیش کیا ہے۔ جن کی بنا پر شبلی ان سے اور ان کی تحریک کے بعض پہلوؤں سے بیزار ہو گئے بلکہ مخالفت پر بھی آمادہ ہو گئے۔ لیکن انھوں نے شبلی کی اس افتاد طبع کا ذکر نہیں کیا جس نے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو تلخ اور اہم سمجھا اور دیکھا۔ باوجود اس کے یہ تصنیف مولانا شبلی کے متعلق اطلاعات اور معلومات کا بیش قیمت سرمایہ رکھتی ہے۔ پھر بھی آٹھ سو سینتالیس صفحوں کی اس کتاب کو شبلی۔ کی مکمل اور جامع سوانح عمری کہنے میں تامل کیا جاتا ہے۔

مولانا عبد السلام ندوی اسی سلسلے کے ایک اور مصنف ہیں۔

آپ کی تصانیف (۱) فقرائے اسلام (۲) سیرت عمر بن عبدالعزیز (۳) اقبال کامل ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی کا نظریہ سیرت نگاری افادی اور مقصدی ہے۔ فقرائے اسلام ایک مختصر تذکرہ ہے جس کی تصنیف کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ۔

"اس میں جن علماء کے حالات درج کئے گئے ہیں ان کے پڑھنے سے ان لوگوں کو عبرت اور بصیرت حاصل ہوگی جو اس زمانے میں علم و مذہب کے لئے مصائب برداشت کرنے میں جھجکتے ہیں"

(فقرائے اسلام صفحہ ۴)

اس تذکرہ میں مصنف نے سب سے اول نام رسول خدا صلعم کا رکھا ہے۔ اور اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ آپ نے راہ خدا میں جو مصائب برداشت کئے ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مصنف نے آپ کی بلند کرداری کو اسی صفت یعنی فقر و فاقہ سے نمایاں کیا ہے۔

"انسان غربت کی حالت میں بدمعاملگی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جود و سخا ایثار مہمان نوازی سوال سے نفرت صدقہ سے اجتناب، عدم قبول احسان ایسے اخلاقی محاسن ہیں کہ ایک فاقہ زدہ شخص کے لئے تقریباً ناممکن ہیں ایک محتاج شخص عزم و استقلال پر قادر نہیں ہو سکتا ایفائے عہد نہیں کر سکتا۔ فقر و فاقہ کی حالت میں سنگدل ہو جاتا ہے

وہ ایسی حالت میں عزیزوں بچوں غلاموں اور اولاد کی کی محبت کیا کرسکتا ہے؟

(غفرائے اسلام صفحہ ۱۳)

مولانا عبدالسلام ندوی کی تحریر میں ایک خاص خشکی اور بے گانگی ہے اور انھوں نے شعرالہند جیسے موضوع کو بھی بڑے اختصار سے اور خشک پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ سوانح نگاری میں جہاں تک واقعات کا تعلق ہے یہ بیگانگی عیب میں شمار نہیں. ہوتی۔ پھر بھی سوانح نگار کی اپنے موضوع کے ساتھ دلچسپی ضروری ہے مولانا نے اس تذکرے سے بیگانگی اور بے تعلقی کا برتاؤ کر کے ان کو بے جان تاریخی موضوعات بنا دیا اور سوانح نگاری کے لحاظ سے تذکرہ غیر اہم ہے۔

سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں مولانا اپنی مخصوص بے تعلقی کو برقرار نہیں رکھ سکے۔ اس تصنیف میں جہاں مولانا کے ہیرو کی شخصیت نظر آتی ہے۔ وہاں خود ان کی شخصیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اول تو موضوع کا انتخاب ہی اپنے مصنف کے نظریئے اور مزاج کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ خود بھی انھوں نے اپنے سبب انتخاب پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مولانا شبلی نے رائل ہیروز آف اسلام کے لئے خاندان بنو امیہ کے خلفاء میں ولید بن عبدالملک کو منتخب کیا تھا۔ جس نے اپنے

اکیس سالہ دورِ حکومت میں نہ صرف سلطنت کی بنیادیں مستحکم کیں بلکہ فتوحات اور عمارات میں بھی نمایاں اور قابلِ قدر اضافے کیے۔ شبلی اسلام کے شاندار ماضی کے شاندار پہلوؤں ہی کے مورخ تھے۔ لیکن مولانا عبدالسلام صاحب کا نقطۂ نظر شبلی سے مختلف ہے انھوں نے اپنی سیرت نگاری کے لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو منتخب کیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک۔

"اسلام کا روشن ترین زمانہ صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوا اور خلافت راشدہ تک پہنچ کر ختم ہو گیا۔ اس لئے خلفائے اسلام کا قابلِ فخر کارنامہ یہ نہیں ہے کہ انھوں نے دنیا کو اس نقطۂ نورانی سے آگے بڑھایا بلکہ ان کا حقیقی شرف یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کو اس قدر پیچھے ہٹایا کہ وہ عہدِ صحابہؓ سے جا کر مل گیا۔"

(دیباچہ سیرت عمر بن عبدالعزیزؓ صفحہ ۲)

سطورِ بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں شرف و عظمت کی کیا اقدار ہیں ان کا یہ انتخاب ان کے نظریے کے عین مطابق ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز ہی وہ شخص ہیں جنھوں نے زمانے کی باگ پھیر کر اس کو عہدِ صحابہ سے ملا دیا۔ عمر بن عبدالعزیز کا غیر متوقع انتخاب اور پھر وہ اصلاحیں اور تبدیلیاں جو حضرت عمر بن عبدالعزیز

جانب حارانہ بیان سے گریز کیا ہے

اقبال کامل یہ شاعر مشرق کی سوانح عمری تو نہیں البتہ حالات زندگی اور ان کے کلام پر تنقید ہے۔ ان کے اس انتخاب پر حیرت ہوتی ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کا قلم اور ایک فن کار ودبھی شاعر کو اپنا موضوع بنائے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت اس وقت ہوتی ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کے متعلق دوسرے لکھنے والوں کے برعکس وہ اس کو نسا پیغامبر مفکر فلسفی سیاست داں یا مرد مومن بنا کر پیش نہیں کرتے۔ بلکہ وہ ان کو سب سے پہلے ایک فن کار سمجھتے ہیں۔ ایسا فن کار جس کے فن میں فکر کی گہرائی ہے اور زندگی کے تقاضوں کے متعلق پیغام ہے جس میں امید ہے اور اس سب سے زیادہ فنی شعور اور پختگی ہے۔

یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاتا ہے چنانچہ اس بارے میں مصنف کا سرمایۂ معلومات محدود نہ تھا جو اس کو کسی تصنع اور تکلف سے کام لے کر مواد کی کمی کا عیب چھپانا پڑتا اس کے برعکس یہاں دوسری دشواری مواد کی کثرت اور اطلاعات کا ہجوم دیکھ کر مصنف چلا اٹھا ع۔

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

لیکن مصنف نے اس امر کی بڑی احتیاط کی کہ یہ خواب پریشان نہ ہو جائے۔

"باایں ہمہ میں نے کوشش کی ہے کہ میری اس کتاب سے یہ خواب پریشان نہ ہونے پائے بلکہ اس کی ایک ایسی تعبیر نکل آئے جو اس کو خواب پریشان کے بجائے رویائے صالحہ بنادے۔"

(دیباچہ اقبال کامل صفحہ ۲)

چنانچہ انھوں نے انتخاب کے وقت بڑی احتیاط سے کام لیا ہے انھوں نے اس تمام مواد کا مطالعہ اس نظریہ سے کیا ہے کہ:۔

"اس میں کون سا حصہ قابل اخذ و انتخاب ہے کون سی باتیں منتشر و پراگندہ ہیں۔ جن کو ایک خوبصورت ترتیب سے یکجا جمع کیا جا سکتا ہے۔ اور کون سی چیز تشنہ و نامکمل ہے جس کی تکمیل کی جا سکتی ہے۔"

(اقبال کامل صفحہ ۲)

انھوں نے حالات زندگی کے بارے میں زیادہ دماغی و قلمی کاوش سے کام نہیں لیا ہے۔ معمولی تغیر و تبدل کے بعد حوالے کے ساتھ اسی مواد کو درج کر دیا ہے۔

"اس مواد کو تقریباً انہی کے الفاظ و عبارت میں مناسب ترتیب کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔"

چونکہ وہ ان کو ایک فنکار کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور اسی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے ان کی سیرت و عادات کے ان

عمل میں لائے اس امر کی متقاضی ہیں کہ ان کا ایک سیاسی پس منظر بھی پیش کیا جائے تاکہ ان حالات کا صحیح اندازہ ہو سکے جس سے صاحب سوانح کو دوچار ہونا پڑا اسی کی روشنی میں ہیرو کی شخصیت اور اس کے کارناموں کی اہمیت متعین ہوتی ہے۔ لیکن بیشتر سوانح نگار اس منزل پر آ کر افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بعض لکھنے والے تاریخی واقعات اور پس منظر کو اتنی طوالت اور اہمیت دیتے ہیں۔ کہ اصل موضوع کی حیثیت ضمنی ہو جاتی ہے اور بسا اوقات سوانح نگار اپنی شخصیت اور طرز کو نمایاں کرنے کے شوق میں تاریخی واقعات کو یکسر پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ دراصل تاریخی واقعات کا احترام اور معقول استعمال سوانح نگار کے لئے بہت ضروری ہے۔ ہمارے مصنف نے ایسے بہت سے سیاسی خاکے کے ذریعہ بتایا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد اسلامی جمہوریت کی قیادت کس طرح خاندان بنو امیہ میں منتقل ہو کر شخصی حکومت اور میراث بن گئی اور پھر کس طرح اس رواج کے خلاف عمر بن عبدالعزیزؒ تک پہنچ گئی۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ اس وقت اسلامی تصور جمہوریت کو کس طرح پامال کیا جا رہا تھا۔ پھر اس وقت جبکہ عنان سلطنت ان کے ہیرو کے ہاتھ میں آئی تو حدود سلطنت کہاں تک پھیل چکی تھیں۔ اور ان کو کتنی بڑی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا تھا۔

اس کے بعد ان کے حصول خلافت ان کی منفردانہ کارگزاریوں اصلاحات اور احساس فرض کو بڑی تفصیل سے جذباتی طور پر بیان

کیا ہے۔ دراصل یہی خاص موضوع ان کا مقصود اصلی ہے۔ اور وہ یہی بتانا چاہتے تھے۔ کہ کس طرح ان کی شخصیت نے زمانے کا رخ بدل کر اس کو عہد راشدین سے جا ملایا تھا۔ اسی خاص مرکزی نقطہ کی روشنی میں وہ ان کی سیرت کے تمام پہلوؤں کو یکے بعد دیگرے پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا اپنے تمام پیش روؤں یعنی بنوامیہ کے تمام بہادر خلفاء کے طور و طریق کے خلاف دلیرانہ اور مجاہدانہ اقدامات کرنا۔ اس تمام مغصوبہ مال اور جاگیروں کو واپس کر دینا جو عوام سے چھین کر بنو امیہ نے اپنے خاندان والوں میں تقسیم کر دی تھیں اور اس کے بارے میں خاندان والوں کی مخالفتوں اور ناراضگیوں کا متانت حلم اور استقلال سے مقابلہ کرنا خلافت سے پہلے کی زندگی تن آسانی تنعم خوش لباسی اور نفاست پسندی غرضکہ اور جاہ پسند اور خلافت ملنے کے بعد انکساری حلم مروت جفاکشی کا ذکر کر کے ان کی سیرت اور مزاج کے اس بڑے انقلاب کو پیش کیا ہے۔ عام اصلاحات کے علاوہ ان کے خاص خاص انتظامات اور اصلاحات کا ذکر بھی بالترتیب علیحدہ علیحدہ عنوانات کے ماتحت ذکر کیا ہے۔ ان کی جامع اور محبوب شخصیت ان کی طبیعت کے متضاد پہلوؤں یعنی اولاد سے بے انتہا محبت دوسری طرف سختی ہے ان کی ترتیب کی طرف توجہ پہ بڑی اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔ اس سیرت میں ان کی بے تعلقی ایک وصف بن گئی ہے۔ اور انھوں نے

ہیں جو سوانح نگار اپنے موضوع کے حالات بیان کرتے وقت شامل کرتا ہے۔ یہ کتاب اقبال کی سوانح عمری سے زیادہ اقبال کے مطالعہ کے لئے مناسب اور موزوں ہے

حبیب الرحمان جذباتی رنگ میں لکھنے والے ایک اور سوانح نگار حبیب الرحمٰن خان شیروانی ہیں۔ آپ کی تصنیفات ذکر جمیل۔ نابینا علمار علمائے سلف۔ سیرت صدیق میں نابینا علمار اور علمائے سلف مختصر سے تذکرے ہیں۔ جن میں کوئی خاص قابل ذکر بات نظر نہیں آتی۔

ذکر جمیل۔ رسول اکرمؐ کا تذکرہ ہے۔ اس کے متعلق یہ فیصلہ بھی مشکل ہے کہ یہ میلاد شریف کی نوع سے متعلق ہے یا تذکرے سے شروع میں تو بالکل وہی انداز ہے۔ اسی طرح آپؐ کی ولادت کا حال اور مختلف روایات بیان کی ہیں۔ اکثر نعتیہ نظمیں بھی دی ہیں۔ پھر صحیح اور مستند حالات درج کئے ہیں۔ دراصل یہ میلاد شریف کی پہلی ترقی یافتہ شکل کہی جاسکتی ہے۔

سیرت صدیقؓ۔ مشکل سوانح عمری ہے اور اس میں حضرت ابوبکرؓ کے حالات قبل از اسلام بعد از اسلام اور خلافت کے بعد درج کئے ہیں۔ ایک خاص چیز یہ ہے کہ اپنے ہیرو کے خصائل۔ تدبیر حکمت بے نفسی اور خلوص کو ان کے ان خطبات کی مدد سے پیش کیا ہے جو انھوں نے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد استشہاد کے موقعوں پر اور خلیفہؓ

رسول کی حیثیت سے دیئے۔ انتظام مملکت اور فتوحات کا بھی تفصیلی ذکر ہے۔ ذاتی حالات بہت اختصار سے بیان کئے ہیں۔ لیکن ایسے واقعات منتخب کئے ہیں جن سے ان کے سیرت اور مشاغل پر روشنی پڑتی ہے۔

"خلافت سے پہلے محلے کی لڑکیاں ان کے پاس بکریاں لاتیں اور دودھ دوھ دیتے۔ جب خلیفہ ہو کر محلے میں گئے تو لڑکیوں نے دیکھ کر کہا اب یہ دودھ نہیں دوہیں گے۔ تو جواب میں کہا ضرور دوہوں گا۔ مجھ کو خدا کی ذات سے امید ہے کہ منصب سے میری کسی عادت میں فرق نہ آئے گا۔"

(سیرت صدیق رضؓ صفحہ)

اسی طرح ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔

"ایک روز سرور عالم ﷺ نے صحابہ سے مخاطب ہو کر دریافت کیا آج تم میں سے روزہ کس نے رکھا۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ میں نے ؟

جنازہ کے ساتھ کون گیا ؟" حضرت ابوبکر رضؓ میں !

"محتاج کو کھانا کس نے کھلایا۔ ؟" حضرت ابوبکر رضؓ میں نے !

"بیمار کی عیادت کس نے کی ؟" حضرت ابوبکر رضؓ میں نے !

(سیرت صدیق صفحہ ۸۷)

ان دونوں واقعات سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ حضرت صدیق رضؓ

پہلوؤں اور واقعات پر بھی روشنی ڈالی ہے جو ان کے فنکارانہ مزاج کو نمایاں کرتے ہیں مثلاً انکی خودداری اور استغنار کے متعلق جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ایک فنکار کی نظر میں بلند اور اسکے مزاج میں کس حد استغنا ہوتا ہے اور وہ واقعہ ہے جب پنجاب میں یہ تحریک شروع ہوئی تھی کہ دو لاکھ کی رقم جمع کر کے ان کی خدمت میں پیش کی جائے۔ لیکن ان کی خودداری اور غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنی غریب قوم پر ایسا بار ڈالیں۔ ان کا فن حقیقی فن تھا۔ اور وہ منت غیر کا طالب نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس کی مخالفت کی اور کہا ہے۔

"یہ صحیح ہے کہ میرے اوقات کا بیشتر حصہ فکر معاش اور دنیوی مکروہات میں ضائع ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ اگر میں زندگی کی کش مکش سے علیحدہ ہو جاؤں تو میری شاعری اس تڑپ سے محروم ہو جائے گی جس کا سب سے بڑا منبع خود زندگی ہے"

(اقبال کامل صفحہ ۱۸)

تنقیدی حصہ پر انھوں نے اپنی دماغی کاوشوں سے کام لیا ہے۔ اگرچہ بظاہر کسی شخص کے کاموں اور تصانیف کی تنقید کو سوانح نگاری میں زیادہ اہمیت نہیں۔ لیکن بعض دفعہ سوانح نگار یہ تنقید صاحب سوانح کے مزاج اور رجحانات کی روشنی میں کرتا ہے۔ اور اس سے ایک دلچسپی کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبال پر ایک فلسفی صوفی مفکر کی حیثیت سے ان کے مذہبی اور سیاسی افکار کی روشنی میں بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے لیکن عبدالسلام صاحب کا کہنا ہے کہ لکھنے والے یہ نظرانداز کر دیتے ہیں کہ وہ ایک شاعر تھے اور ان کے افکار شاعرانہ طرز و اسلوب میں ہی لکھے گئے ہیں۔ اکثر ان کے مسائل و افکار کو پیش کرتے وقت ایسی ہی مثالیں دی جاتی ہیں جن میں شاعری کے عناصر کم پائے جاتے ہیں ڈاکٹر صاحب بھی خود کو شاعر نہیں کہتے اور غزل گو شاعر بننے سے تو ان کو شدت سے انکار ہے۔ لیکن مصنف کا کہنا ہے کہ:۔

"میرے نزدیک ان کا کلام خشک فلسفیانہ صوفیانہ اور سیاسی مسائل کا مجموعہ نہیں ہے یعنی وہ صرف ناظم نہیں وہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں اس لئے میں نے فلسفیانہ صوفیانہ مسائل سے پہلے ان کی ذات کو شاعر کی حیثیت سے پیشِ نظر رکھا ہے۔"

(دیباچہ صفحہ ۴)

زیادہ تر ان کی غزلیات قطعات اور نظموں سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں جن میں شاعری اور فلسفہ دونوں کا خوشگوار امتزاج موجود ہے۔

باوجود اس کے کہ مصنف نے اقبال کے حالات زندگی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ لیکن وہ اس لگاؤ اور انس سے محروم

جوشِ عقیدت ٹپکتا تھا۔ ہر ادا ثابت کرتی تھی کہ ایک عقیدت مند مرید اپنے مرشد کی خدمت میں عرض پرداز ہے مثلاً عروج حیدر آباد کے زمانے میں ایک مجمع نے یہ سماں دیکھا کہ وقار الملک کی ترکی ٹوپی ان کے ہاتھ میں ہے گھٹا ہوا سر سید کے سامنے جھکا ہوا ہے۔ زبان سے کہہ رہے ہیں یہ سر حاضر ہے۔ جوتیاں مار لیجئے مگر عرض یہی کروں گا کہ رائے آپ کی غلط تھی۔"

(صفحہ ۱ دیباچہ وقار حیات حبیب الرحمان خان)

غرض انکا یہ دیباچہ بڑا جامع ہے اور یہ مختصر سا خاکہ جو انھوں نے اس دیباچہ میں وقار الملک کا کھینچا ہے ان مذکورہ سوانحی تصنیفات پر بھاری ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے اس کتاب کی تیاری میں مولوی اکرام اللہ صاحب کو جو مشورے دیئے یا معلومات و اطلاعات کے ذرائع بہم پہونچائے ان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو سوانح نگاری کا صحیح تصور تھا۔

مولوی اکرام اللہ ندوی

سلسلہ ندویہ کے تربیت یافتہ ہیں حبیب الرحمان خاں شروانی کی فرمائش پر انھوں نے نواب وقار الملک کی سوانح عمری "وقار حیات" کے نام سے مرتب کی ہے۔ مولوی صاحب کی یہ تصنیف ان کی تحقیق وتلاش انتھک محنت ان کے قلم کی دیانت داری متانت اور خوش خلیقگی کی بہترین مثال ہے۔

زمانہ نواب وقار الملک کو سرسید کے ایک رفیق قریبی کی حیثیت سے ہی جانتا ہے لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ نواب وقار الملک کبھی منشی مشتاق حسین بھی تھے جو تحصیل مراد آباد میں بیس روپے ماہوار کے محرر انکم ٹیکس تھے۔ پھر منشی مشتاق حسین کی زندگی میں یہ زبردست انقلاب کیسے آگیا وہ زمین سے آسمان پر کیسے پہنچ گئے۔ یہ کوئی اتفاق نہ تھا یہ کوئی طلسم یا اسم اعظم نہ تھا جس نے ان کو انتہائی پستی سے اٹھا کر عروج و کمال کی انتہائی بلندی پر پہنچا دیا۔ بلکہ یہ ایک جفاکش دیانت دار منتظم اور مخلص انسان کی زندگی کے تدریجی مراحل تھے۔ اور اس کی بے شمار کوششیں اور کام تھے وہ چھوٹے چھوٹے کام اور فرائض جو ہر معمولی ملازمت پیشہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ اس کی صلاحیتوں اور تدبیر سے کارنامے بن گئے۔ ان فرائض کی ادائیگی میں ان کارناموں کی انجام دہی میں صاحب سوانح کو یقیناً دقتیں اٹھانا پڑی ہوں گی۔ لیکن نہ اتنی جتنی اس کے سوانح نگار کو انھیں یکجا و مرتب کرنے میں پیش آئیں ہوں گی۔ صاحب سوانح کی زندگی میں واقعات اچانک یا سوچے سمجھے ہوئے یکے بعد دیگرے آتے چلے جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی صلاحیت۔ لیاقت اور استعداد کے مطابق ان سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ لیکن غریب سوانح نگار دیدہ و دانستہ ان واقعات کو پھر سے آواز دیتا ہے اور وہ سب کے سب اس کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے صاحب سوانح کی کشت حیات سے۔ ریزہ ریزہ دانہ دانہ چنتا پھرتا ہے ان کا انبار لگاتا ہے پھر ان کو علیحدہ علیحدہ

کن عادات اور کیسی شخصیت کے مالک تھے۔

اپنے ہیرو کے فضائل اور عظمت خود اپنے بیان اور لمبی چوڑی تمہیدوں یا مختلف واقعات سے ظاہر کرنے کے بجائے وہ خطبہ درج کیا ہے جو حضرت علیؓ نے ان کی وفات کے بعد ان کے دروازے پر کھڑے ہو کر دیا اور اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اکثر مورخین ہر دو حضرات کے تعلقات میں کشیدگی بھی بتاتے ہیں۔ اس خطبہ نے بغیر کسی کوشش کے اس کو بھی ثابت کر دیا ہے کہ اس میں کچھ زیادہ حقیقت نہیں۔

"تمہاری آواز سب سے پست تمہارا تفوق سب سے اعلیٰ تمہارا کلام سب سے زیادہ باوقار۔ تمہاری گفتگو سب سے زیادہ باصواب تمہاری خاموشی سب سے زیادہ طویل تمہارا قول سب سے زیادہ مبلغ تمہاری ذات سب سے زیادہ شجاع اور معاملات سے زیادہ واقف عمل میں سب سے زیادہ بزرگ۔ واللہ تم اہل دین کے سردار تھے۔ جب لوگ دین سے ہٹے تو تم آگے بڑھے جب وہ دین پر جھکے تو تم ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ تم اہل ایمان کے مہربان باپ تھے اس مہربدری سے وہ تمہاری اولاد بن گئے۔"

(صفحہ ۱۰۷)

مجموعی طور پر حبیب الرحمٰن خان شروانی کو اعلیٰ درجہ کا سوانح نگار نہیں کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ موصوف نے اکرام اور ندوی کی تصنیف وقار حیات کے دیباچہ میں وقار الملک کی شخصیت اور سیرت کو بڑے جامع الفاظ میں متعارف کروایا ہے۔ اور ان کے دیباچے ہی کو دیکھ کر ہم کو کتاب کے ہیرو کے متعلق بہت کچھ معلومات ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ان کی مستعدی اور ہمت کے متعلق لکھا ہے۔

"بزدلی اور کاہلی یہ لفظ ان کی لغات زندگی میں لکھے ہی نہیں گئے' آخر عمر میں کمزوری سے گھٹنوں میں درد ہے تاہم بلند زینہ چڑھتے اترتے ہیں۔ جب عرض کی اس زحمت فرمانے کی کیا ضرورت تھی جواب دیا بلکہ دل پر لکھ دیا کہ انسان کو اتنی محنت کا خوگر رہنا چاہیئے۔"

(دیباچہ از حبیب الرحمٰن خان شروانی وقار حیات صفحہ ۸)

سرسید احمد خان کے ساتھ دیرینہ اور وفادارانہ رفاقت کے باوجود بعض امور میں اختلاف بھی تھا۔ لیکن کس نوع کا یہ حبیب الرحمان خاں ہی کے الفاظ میں دیکھئے۔

"اس رفاقت کا دور اس صدی کا ایک ثلث ہے اس دراز مدت میں ایک بار سے زیادہ اختلاف ہوا شدید ہوا اظہار اختلاف کا لہجہ بھی حریفانہ اور عقیدت مندانہ تھا۔ اختلاف پر اصرار کے وقت بھی تحریرے تقریرے حرکات سے سکنات سے

ہی ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے دوروں اور معائنوں کے سلسلے میں دیتے رہے تھے۔ اور اس طرح مصنف اپنی طرف سے اپنے ہیرو کی صفات کے متعلق کوئی خاص دعویٰ نہیں کرتا بلکہ ان کاموں اور جذبات کا سرسری ذکر کرتا جاتا ہے۔ اور ان کی فطرت کے تمام پہلو خود بخود قاری کے سامنے آتے جاتے ہیں۔ اور بغیر مصنف کے ایک لفظ کہے ہوئے یا سفارش کئے ہوئے وہ خود بخود صاحب سوانح کی شخصیت سے مانوس اور مرعوب ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً ان کا رعایا سے ملاقات کرنا اور تحقیق کرنا اور اس سلسلے میں ان کا طریق کار انہی کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے جو ان کے انتظام اور تدبیر کے ساتھ ہی ان کی فطرت کی بھی آئینہ دار ہے

"شروع شروع میں میں نے دیکھا کہ لوگ بہت خوش اور محتاط ہیں۔ اور جب ان سے دریافت کیا کہ تم کو کسی قسم کی تکلیف یا کوئی شکایت ہو تو کہو علی العموم اس کا یہی جواب ہوتا کہ ہم سب خوش ہیں۔ سب راضی ہیں۔ سرکار کا انتظام درست ہے ہم کو کوئی تکلیف اور شکایت نہیں ہے۔ لیکن جب ان کے ساتھ زیادہ خلاملا اور ان کی تکلیفوں کا خود اپنی طرف سے ذکر اور اس پر افسوس کیا گیا اور ان کے ذہن نشین کر دیا گیا کہ نواب مدارالمہام سرکار عالی نے مجھ کو اسی لئے بھیجا ہے جو کچھ دکھ درد رعایا کو ہے۔ اس کو رفع کرنے کا بندوبست کیا جائے تو پھر

انھوں نے شکایتوں کے دفتر کھول دیئے اس قدر کہ ان کی یادداشتیں لکھنا اور ان پر غور کرنا اور ان کی حقیقت اور علت کو دریافت کرنا اور ان کے رفع کرنے کی تجویزیں سوچنا خود ایک بڑا کام ہے۔"

(صفحہ ۷۹)

اس پورے اقتباس کے بعد انھوں نے اپنی طرف سے محض اتنا اضافہ کیا ہے۔

"مندرجہ بالا الفاظ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولوی مشتاق حسین کو رعایا کے مصائب و مشکلات کا کس قدر خیال تھا اور اپنے فرائض کو کیسے صحیح طریقہ سے ادا کرنا چاہتے تھے۔

(وقار حیات صفحہ ۷۹)

رعایا کی بدحالی سے ان کو سخت رنج تھا۔ اور ساتھ ہی وہ عوام کے ہمدرد اور قدر دان تھے اور ان کے اوصاف کے مداح۔ جیسا کہ انکی رپورٹ کے اس حصہ سے ظاہر ہے۔

"اس محنتی اور راستباز اور کفایت شعار گروہ کو اگر آسودہ حال ہوجانے کے مواقع مل جاویں تو اس کا بھی بخوبی یقین ہے کہ بہت کم مدت میں ان کی حالت درست ہوجاوے گی۔ ملنگانہ کا ایک تعلقہ جہاں سرسری بندوبست سرسری اور ہوجاوے اپنی رعایا کی حالت کو پانچ برس کے

ڈھریوں میں تقسیم کرتا ہے۔ یہ کام آسان تو نہیں ہے اور پھر ایسے شخص کے حالات اور کاموں کی فہرست تیار کرنا جس کے چھوٹے چھوٹے بے حقیقت کام ہی اس کے کارنامے ہوں۔ اپنی اس محنت اور دقت کا ذکر مصنف نے تو سرسری ہی کیا ہے لیکن ان کی تلاش اور چھان بین کی گواہی کی حبیب الرحمٰن خان شروانی دیتے ہیں۔ اور ان کے انہماک کا عالم بتاتے ہیں۔

"موسم نہایت گرم مئی جون کا تھا۔ مولوی صاحب صبح سے تلاش مقصود میں نکل جاتے شام کو واپس آتے اس اثناء میں کاغذات گھنٹوں پڑھتے لوگوں سے ملتے ضرورت ہوتی تو میلوں پیدل چلتے۔ شام کو یہ حالت ہوتی کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا۔"

(دیباچہ وقار حیات صفحہ، حبیب الرحمان خاں)

وقار الملک کے کاموں کی اہمیت اور ان کے انتظامات و اصلاحات میں ان مشکلات کا جو انھیں درپیش تھیں۔ اس وقت تک اندازہ لگانا مشکل ہے جب تک اس وقت کی وہ سیاسی فضا اور حالات نہ معلوم ہوں جس سے حیدر آباد گزر رہا تھا۔ اس کو انھوں نے بڑی تلاش اور محنت سے فراہم کیا۔

"میں حیدر آباد کی عام حالت و سیاست سے قطعاً بیگانہ و نا آشنا تھا۔ اور خصوصیت کے ساتھ نواب وقار الملک

کے عہد کی سیاست کو سمجھنا چاہتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ کے کے عہد میں حیدرآباد بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ہر طرف اصلاح بیداری زندگی اور زندہ دلی کے آثار نمایاں ہیں۔ لیکن گذشتہ عہد کا حیدرآباد کچھ اور تھا جب تک اس عہد کی حالت معلوم نہ ہو نواب وقار الملک کی خدمات کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

(دیباچہ مصنف وقارِ حیات صفحہ ۳)

پھر ان کے تمام کاموں اور ان رپورٹوں کا جزیاتی جائزہ لیا ہے جو وہ وقتاً فوقتاً داخل کرتے رہے تھے۔

"یہاں صوبہ داری کے دفتر میں نواب صاحب مرحوم کے عہد کے کاغذات کا کافی ذخیرہ تھا۔ ہزاروں صفحے تو مختلف مقدمات کے فیصلوں کے متعلق خود نواب صاحب مرحوم کے ہاتھ کے لکھے۔ اس طومار کا پڑھنا اور سمجھنا اور ضروری مضامین کا انتخاب کرنا آسان کام نہ تھا لیکن مسلسل معروفیت نے اس دشواری کو حل کر دیا۔"

(دیباچہ مصنف وقارِ حیات صفحہ ۴)

اس کتاب میں چند باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ صاحب سوانح کے مزاج اور طبیعت کا اندازہ محض ان رپورٹوں کے اقتباسات سے

اندر اس قدر درست کر سکتا ہے کہ وہ ساہوکاروں کے پھندے سے نجات پا سکتے ہیں۔"

(وقارحیات صفحہ ۸۵)

ان سرکاری رپورٹوں اور خالص دفتری کاروبار کو کچھ ایسی سادگی اور سلاست سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو اس میں خشکی یا بے کیفی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ بہت لطف آتا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ امور صاحب سوانح کی شخصیت اور ذات پر حاوی نہیں ہیں بلکہ اس کی زندگی کے بڑے دلچسپ حصے اور پہلو بنا کر پیش کئے ہیں اسی طرح حیدر آباد کی سیاسی فضا وہاں کے نخریبی اور شر پسند عناصر اندرونی سازشوں اور امراء کے باہمی تعلقات چپقلشوں کا حال بھی ضمنی طور پر انہی واقعات میں اس طرح کھپاتے چلے گئے ہیں۔ کہ ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں معلوم ہونے لگی ہیں۔ کتاب کی دلچسپی اور نفس موضوع میں ذرہ برابر خلل نہیں پیدا ہوا ہے۔ بلکہ یہ سیاسی پس منظر خود صاحب سوانح کی شخصیت اس کی خدمات اور مشکلات آپس میں مربوط ہو کر ایک ناول کی طرح مسلسل اور دلچسپ ہو گئے ہیں۔

یہ رپورٹیں ایک طرف تو صاحب سوانح کے حسن انتظام دقت نظر ذکاوت اور اس کی ہمدردی و نیک سیرت کو خود بخود واضح اور نمایاں کرتی جاتی ہیں اور اس کے دلی جذبات عوام سے ہمدردی ان کی فلاح و بہبود کے خیال سے قاری کو آشنا کر دیتی ہیں دوسری طرف ان کے

ذریعہ حیدرآباد کی سیاسی۔ اقتصادی اور ملکی تاریخ خود بخود مرتب ہوتی جاتی ہے۔

اتنی لمبی روداد اور طویل وقفے کے بعد جب ان کا ہیرو آفتاب اقبال کے نصف النہار پر پہنچ جاتا ہے۔ تو ایک بار پھر قاری کے ذہن کو اس امر کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ ان کا ہیرو کس حیثیت سے عروج کو پہنچا اور کیوں پہنچا۔

• دیانت و صداقت انسان میں جرأت اور دلیری پیدا کر دیتی ہیں اور یہ چیزیں نواب وقار الملک کا خاص جوہر تھیں۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو امروہہ کے منشی مشتاق حسین جو تحصیل مراد آباد میں بیس روپیہ ماہوار کے محرر انکم ٹیکس تھے حیدرآباد کے نواب وقار الملک نہ ہوتے۔

(وقار حیات صفحہ ۲۹۸)

اسی طرح علی گڑھ یونیورسٹی کی خدمات اور مسلمانوں کی سیاسی قیادت کا ذکر بھی تدریجاً کرتے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی وفات تک پڑھنے پر ان کی زندگی کا ہر پہلو ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کے ذاتی اخلاقی اور معاشرتی پہلوؤں پر دوبارہ روشنی ڈالی ہے۔ اور اس سلسلہ میں کبھی کبھی ان کی تحریریں سچے اور مخلصانہ جذبات بھی شامل ہو گئے ہیں۔ لیکن کہیں غلط جوش یا مبالغہ کا نام نہیں۔ بلکہ جس موقع کی عکاسی کرنا چاہی ہے۔ اس کا صحیح تصور سامنے آ جاتا ہے

مثلاً نواب وقار الملک کے آخری ایام حیات میں ان کا قوم کی نظر میں جو مقام تھا اور قوم کی جو حالت تھی اس کا بڑے پیارے اور موثر الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔

"لیکن اب بھی وہ تمام مسلمانان ہند کی امیدوں کا مرکز تھے اب بھی قوم کی آنکھیں ان کی طرف لگی ہوئی تھیں اب بھی یہ حالت تھی کہ قومی معاملات کے متعلق جو لفظ ان کے لب دو دہن سے نکلتا تھا اس کی صدائے باز گشت تمام ہندوستان میں سنی جاتی تھی۔ سر سید کی برہم شدہ بزم کی یہ آخری شمع بھی اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہونے والی تھی۔ لیکن اس جھلملاتی ہوئی حالت میں بھی نوجوانوں کے لئے رہنما تھی اور قوم اس کی دھندلی روشنی میں راستہ تلاش کر سکتی تھی۔"

(وقار حیات صفحہ ۷۰۶)

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ وقار حیات تاریخ و سوانح کا سنجیدہ باوقار اور حسین امتزاج ہے اور اردو کی چند بہترین سوانح عمریوں میں شمار ہونے کے لائق ہے

جیسا کہ گزشتہ اوراق میں ذکر آچکا ہے کہ ہماری جدید سوانح نگاری کے دو دبستان بن گئے۔ ایک وہ گروہ جو جذباتی اور افادی نظریئے کے ماتحت سوانح نگاری کرتا ہے اور اس فن کو قومی ترقی اور عظمت کا

ذریعہ بنانا چاہتا ہے اور دوسرا فریق یا دبستان وہ ہے جو کسی بھی انسان
کے حالات زندگی سیرت یا کردار کو محض اس کی شخصیت کے لئے پیش
کرتا ہے اس گروہ کا دائرۂ عمل اور نظریۂ فن زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے
یہ لکھنے والے شخصیت نگاری میں تاثرات کی آمیزش کے بھی قائل ہیں
اور سوانح عمری میں جزئیات کی تحقیق کے بھی شائق رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر
واقعات کا صحیح اور جذباتی سراغ لگاتے ہیں۔ لیکن ذاتی تاثرات سے
عموماً احتراز کرتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر مورخانہ ہے۔ بعض کا رجحان خارجی
جزئیات کی ترتیب کی طرف ہے اور بعض واقعات زندگی سے زیادہ
اوصاف اور سیرت نگاری کی طرف مائل ہیں مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید
دور کے سوانح نگاروں کے اس گروہ نے اردو میں ہر قسم کی سوانح عمریوں
کا اضافہ کیا ہے۔ جو ہر لحاظ سے قابل توجہ اور گراں قدر ہے۔ ان میں
سے چند قابل ذکر اور اچھے سوانح نگاروں کے بارے میں کچھ لکھنے سے
پہلے مولوی افتخار عالم مصنف حیات النذیر کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا
ہے کیونکہ مولوی افتخار عالم صاحب جدید دور کے ہر دو دبستانوں میں
عبوری کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ وہ خوش نصیب مصنف ہے
جس کی تصنیف پر اردو کے تین بڑے محسنوں یعنی حالی، شبلی اور مولوی
عبدالحق نے مقدمے لکھے ہیں۔

حیات النذیر۔ بقول حالی مولوی نذیر احمد کی مفصل اور مشرح
سوانح عمری ہے۔ اور جس کے بارے میں مولانا شبلی کا کہنا ہے کہ بڑی

سعی کو تلاش سے لکھی ہے اور دراصل یہ مولانا نذیر احمد کی بڑی جامع سوانح عمری ہے اور محض اس کو پڑھ لینے سے قاری مولانا کی زندگی کے ہر رخ سے آشنا اور مانوس ہو جاتا ہے۔ ان کا بچپن زمانۂ طالب علمی شادی ملازمت تصنیفات غرض ہر قسم کے مشاغل اور ان کے خانگی حالات سے بھی پڑھنے والا کو بی مطلع ہو جاتا ہے۔

حیات النذیر کو مصنف نے سات حصوں میں تقسیم کیا ہے حصہ اول ان کی ابتدائی زندگی، تعلیم نکاح اور دہلی کالج سے فارغ التحصیل ہونے تک ہے اور حصہ دوم ان کی کاروباری زندگی پر مشتمل ہے۔ جس میں ملازمت کے سلسلہ میں امتحانات تجربات۔ انگریزی، تلنگی زبانوں سے واقفیت اور ان کی بڑھتی ہوئی خوش بختی اور ترقیوں کا ذکر ہے۔ تیسرا حصہ ان کی اس زندگی کا آئینہ دار ہے۔ جو انھوں نے حیدرآباد میں گزاری تھی وہاں کا قیام ملازمت سیاسی حالات اختلافات استعفا چوتھا حصہ ان کی نجی اور شخصی زندگی کا مرقع پیش کرتا ہے۔ پانچواں حصہ ان کی تصنیفات پر مشتمل ہے۔ چھٹا حصہ ان کے مذہبی معتقدات پر اور ساتواں حصہ مختلف ضمیموں سے مل کر مرتب ہوا ہے۔ جو مصنف نے صاحب سوانح کی وفات کے بعد شامل کرنا ضروری سمجھے۔

اس جامع اور مفصل سوانح عمری میں ایک چیز کھٹکتی ہے اور وہ اس کی بے جا طوالت ہے جو واقعات اور بات کا لطف کھو دیتی ہے۔ مثلاً مولانا نذیر احمد کی پیدائش کے بارے میں یہ کہنا چاہتے تھے

کہ ان کا سنہ ولادت تحقیق نہیں اس کے لئے لمبی چوڑی تمہید اٹھاتے ہیں اور پھر بتاتے ہیں کہ ہندوستان میں دھوم دھام سے سالگرہ منانے کا رواج ہے اور یہ بدعت ہے پھر کہتے ہیں کہ نذیر احمد کا خاندان اس بدعت کا قائل نہ تھا اور وہ بھی اس انداز میں گویا ڈانٹ کر یہ بات ذہن نشین کرانا چاہ رہے ہیں۔

"ناظرین میں سے اکثر کو معلوم ہے اور جن کو معلوم نہیں وہ معلوم کر لیں کہ صاحب سوانح عمری کا خاندان مولویوں مفتیوں اور مشائخ کا خاندان تھا وہاں ان مراسم کا کیا ذکر یہ باتیں تو وہاں بدعت میں شامل ہوں گی"

(صفحہ حیات النذیر)

مولانا شبلی نے اس کتاب پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے "سوانح نگاری کا آج کل جو طرز ہے وہ ایک قسم کی وکالت کے درجہ تک پہنچ گیا ہے۔ یہ حسن ہے یا عیب یہ تصنیف بھی اس وصف سے خالی نہیں۔"

(مقدمہ از شبلی نعمانی صفحہ ۱۲)

اگرچہ مصنف نے مولانا شبلی کے اس بیان کی خاص تعدید کی ہے اور فٹ نوٹس میں لمبے چوڑے دلائل سے ان کے اس بیان کو غلط ثابت کرنا چاہا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا انداز بیشتر کچھ ایسا ہی ہے کہ گویا وہ صفائی پیش کر رہے ہیں یا وکالت کر رہے ہیں

خصوصاً مولوی نذیر احمد کی تصانیف پر تبصرہ کرتے ہوئے جب ان کی ان تصانیف کا ذکر آتا ہے جن پر اعتراضات کئے گئے تھے وہ ہر ممکن کوشش نہ صرف اپنے صاحب سوانح کو حق بجانب ظاہر کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ بلکہ ان کو شاہ ولی اللہ صاحب پر ترجیح بھی دیتے ہیں۔ جس پر مولانا حالی نے اعتراض کیا ہے۔ لیکن اس سے یہ ہی نہ سمجھ لینا چاہئے کہ موصوف نے محض اپنے موضوع کی حمایت وطرف داری ہی نہیں کی بلکہ جدید تقاضوں کا احترام کرتے ہوئے ان کی کمزوریوں کا بھی ذکر کر دیتے ہیں۔

"ریڈ صاحب نوعمر آدمی تھے اور کنوارے یعنی مجرد اس وجہ سے ان کے مزاج میں ایک قسم کی جلدی تھی اور ادھر ہمارے مولانا بھی مزاج کے دھیمے نہ تھے۔ اس وجہ سے شکر رنجی ہو گئی مگر بعد کے مراسم سے معلوم ہوتا ہے کہ باہمی خلوص بہت کچھ بڑھ گیا تھا۔"

(صفحہ ۳۴، حیات النذیر)

اس کتاب کی تصنیف میں مصنف نے مولانا کے اقتباسات اور خطوط سے بڑی مدد لی ہے اور یہ بہت دلچسپ ہو گئی ہے۔ غرض کہ حیات النذیر نقائص اور محاسن کا مجموعہ ہے ایک پر لطف بات یہ ہے کہ مصنف کی تحریر میں صاحب سوانح کا رنگ غالب نظر آتا ہے چنانچہ وہ کبھی تو نذیر احمد ہی کی سی چلبلی اور بامحاورہ زبان استعمال کرتے ہیں اور کبھی ٹھوس علمی اور منطقی پیرایہ اور یہیں آکر یہ سوانح عمری بے کیفت

ہوجاتی ہے۔ عمومی طور پر اس پر مولانا شبلی کا قول صادق آتا ہے کہ

"مولانا نذیر احمد اس پائے کے شخص تھے کہ اگر یورپ میں پیدا ہوتے تو ان کی بیسیوں سوانح عمریاں لکھی جاتیں ملک اس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا مسرت کی باتیں یہ ہے کہ یہ ضرورت بوجہ احسن پوری ہوئی۔"

(مقدمہ از مولانا شبلی حیات النذیر)

اس میں شک نہیں کہ مولوی افتخار عالم نے بڑی محنت اور دماغ سوزی سے مولانا نذیر احمد کی یہ سوانح عمری تیار کی ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ :۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلہ میں مرزا صاحب کی لکھی ہوئی ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی کا بھی تذکرہ کیا جائے اور اس طرح یہ امر بھی واضح ہو جائے گا کہ مولوی افتخار عالم کی اس مفصل اور مشرح تصنیف کے آگے مرزا صاحب کا یہ مختصر سا مضمون کیا مقام رکھتا ہے اور اس کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے اردو والا طبقہ مرزا فرحت اللہ بیگ کو مزاح نگار کی حیثیت سے جانتا ہے اور ان کی شگفتہ تحریر ہر موضوع کو شگفتگی اور زندگی عطا کر دیتی ہے اور جب موضوع بھی ڈپٹی نذیر احمد جیسا شگفتہ اور جاندار ہو تو پھر اس شگفتگی کا کیا کہنا چنانچہ نذیر احمد کی اس کہانی میں ان کے انداز بیان میں سوانحی تصانیف کی طرح سنجیدگی اور متانت کا ڈھونڈنا عبث ہے۔ اپنی شوخی تحریر کا انہیں خود احساس ہے۔ لیکن اس بارے

ہیں وہ مجبور ہیں چنانچہ اس کے متعلق انھوں نے خود ہی کہہ دیا ہے۔

"لیکن سٹیو میٹو گراف کا یہ قلم پڑھانے سے پہلے میں اپنے طرز بیان کے متعلق معافی مانگ لیتا ہوں۔ کیونکہ میری شوخی بعض جگہ حد تجاوز سے بڑھ جائے گی۔ لیکن آپ تمام قارئین کرام کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ اگر مولوی صاحب خود اپنی سوانح عمری لکھتے تو اسی رنگ میں لکھتے اور اگر آپ ان کی صحبت میں رہے ہوتے تو آپ کو بھی ان کے حالات لکھتے وقت میری ہی طرح معافی مانگنی پڑتی۔ ورنہ آپ کی تحریر بجائے مولوی نذیر احمد صاحب کی سوانح عمری کے کسی شیشہ ملا کے بے لطف واقعات کا مجموعہ ہو جاتی خدا بہتر جانتا ہے کہ اس وقت بھی لکھتے لکھتے پنسل ہاتھ سے رکھ دیتا ہوں اور ایک عالم بے خودی مجھ پر چھایا۔ جاتا ہے مولوی صاحب کی کوئی بات نہ تھی جس میں خوش مذاقی کا پہلو نہ ہو کوئی قصہ نہ تھا جس میں ظرافت کوٹ کوٹ کر نہ بھری ہو۔"

(صفحہ ۵ مضامین فرحت)

مرزا صاحب نے اپنی اس مختصر سی کہانیاں میں حقیقت اور جزئیات نگاری کا پورا پورا التزام کر رکھا ہے۔ اور یہ ان کی حقیقت نگاری ہی تھی جس نے ان کو اتنے دن تک یہ داستان سنانے سے

باز رکھا۔ کیونکہ ابھی تک اردو میں بے دھڑک شخصیت نگاری پوری طور پر وجود میں نہیں آئی تھی اور ان کو یہ اقدام کرتے ڈر ہی لگتا تھا کہ۔

ایچین چھوڑ گھسیٹی میں نہ پڑ جاؤں رہ رہ کر جوش آتا تھا اور ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔

(مضامین فرحت صفحہ ۶)

آخر کو وہ دن آ ہی گیا کہ مرزا صاحب نے برسوں پرانی امانت جو ان کے ذہن و دماغ میں محفوظ تھی سپرد قلم کر ہی دی

خدا بھلا کرے مولوی عبدالحق صاحب کا کہ انھوں نے مجھے اس اگر مگر سے نکالا اور دل کی باتوں کو حوالہ قلم کرنے پر آمادہ کر دیا اب جو کچھ کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا خواہ کوئی برا مانے یا بھلا۔

(صفحہ ۶ مضامین فرحت)

مرزا صاحب نے مولوی صاحب کے حلیہ اور رہن سہن کی مصوری میں کمال کر دیا ہے۔ ایسے مناسب اور موزوں الفاظ استعمال کئے ہیں کہ پڑھنے والے کے سامنے جیتے جاگتے نذیر احمد با ہمہ وضع داری ذہانت شوخی ظرافت آکھڑے ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مرزا صاحب کا حلیہ پیش کرنے میں زبردست ملکہ

حاصل ہے۔ مولوی نذیر احمد کی آنکھوں کی چمک کی تصویر ان الفاظ سے بہتر الفاظ میں کھینچنا محال ہے۔

"آنکھوں میں غضب کی چمک تھی یہ وہ چمک نہیں جو غصہ کے وقت نمودار ہوتی ہے۔ بلکہ یہ وہ چمک تھی جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اگر میں ان کو مسکراتی آنکھیں کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔"

(مضامین فرحت صفحہ ۱۵)

مصنف کا بحیثیت شاگرد صاحب سوانح سے جو تعلق تھا اور اس کی حیثیت سے انھوں نے جو مطالعہ صاحب سوانح کی شخصیت کا کیا اس کے علاوہ بھی انھوں نے اس کہانی میں ان کی زندگی کے چند اہم اور نمایاں واقعات کا ذکر باتوں باتوں میں بڑی خوبی سے کر دیا ہے بلکہ خود صاحب سوانح کی زبانی بیان کروایا ہے۔ مثلاً مولانا کی تعلیمی زندگی اور مشکلات دہلی کالج کا داخلہ اسی طرح مرآۃ العروس اور چیدہ ہند کا اتفاقیہ منظر عام پر آنا۔ ایل۔ ایل ڈی کی ڈگری کا ملنا محسن الملک سے ان کے خوشگوار اور کشیدہ تعلقات پر روشنی ڈالی ہے اور یہ لطف ہے کہ اس طرح انھیں بیان کیا ہے کہ بات میں بات نکلتی چلی آتی ہے سچ تو یہ ہے کہ نذیر احمد کے اس شوخ و گستاخ شاگرد کے قلم سے ان کا جتنا دل کش سچا عکس اور زندہ خاکہ پیش کیا ہے وہ مولوی افتخار عالم کی مبسوط

اور جامع کتاب نہ پیش کر سکی تھی۔ قطع نظر اس کے کہ یہ مولوی صاحب کی شخصیت کی بہت اچھی تصویر ہے۔ مرزا صاحب کی یہ کہانی اردو کے سوانحی ادب میں ایک نئی چیز ہے۔ اور کسی محبوب اور محترم ہستی کو ظرافت و مزاح کے رنگ میں پیش کرنے کا بہترین نمونہ بھی ہے۔

بلاشبہ یہ مختصر سی کہانی مرزا صاحب کے قلم کا بہترین عطیہ ہے جس سے انھوں نے اردو ادب کو نوازا ہے۔

مولانا اسلم جیراج پوری

مولانا اسلم جیراج پوری، حیات جامی، حیات حافظ، سیرت عمر بن العاص کے مصنف ہیں۔ اس کے علاوہ علی گڑھ سے جو رسالہ خاتون نکلتا تھا اس میں مشہور خواتین سلف پر مضامین لکھتے رہے ہیں۔

حیات جامی ۔ مولانا جامی کی سوانح عمری ہے اس تصنیف میں مصنف نے زیادہ تر صاحب سوانح کے ہمعصروں کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں ہی کے واقعات منتخب کئے ہیں۔ مثلاً رشحات لطائف اللطائف تذکرہ دولت شاہ سمرقندی۔ مجالس العشاق۔ ہی ان کی اس تصنیف کے ماخذ ہیں۔ یہ مولانا جامی کا مختصر تذکرہ ہے جس میں ان کی پیدائش۔ خاندان اور تعلیم کے ذکر کے علاوہ ان کی سیرت کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو اکتسابی ہیں اور

خود انہی کی کوشش اور محنت سے انتقار پذیر ہوئے مثلاً ان کی علمیت تصوف عشق وغیرہ وغیرہ، نجی حالات زندگی کے علاوہ ان کے مزاج طبیعت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مولانا جامی کی یہ سوانح عمری کسی خاص انداز کی حامل نہیں ہے اور نہ کوئی خاص قابل ذکر بات اس میں ہے۔

سیرت عمرو بن عاص بھی مولانا اسلم جے راج پوری کی لکھی ہوئی ہے عمرو بن العاص تاریخی ہستی ہیں اور تاریخ دان دنیا ان کو اسلام کے ایک بڑے سپہ سالار کی حیثیت سے جانتی ہے ان کے تمام قابل ذکر حالات زندگی اور کارنامے تاریخ سے ہی متعلق ہیں مسلمانوں کی فتوحات میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ چنانچہ اسلم صاحب نے ان کی یہ سوانح عمری بھی تاریخی انداز ہی پر لکھی ہے۔ ابتدائی اور خاندانی حالات مختصراً بیان کئے ہیں۔ ان کے اصل کارنامے اسلام لانے کے بعد شروع ہوتے ہیں اور یہیں پر انھوں نے تشریح اور تفصیل سے کام لیا ہے۔ آخر میں ان کی وفات اولاد اور ترکہ کا ذکر کیا ہے۔ اور پھر ان کی سیرت اور فطری صلاحیتوں کو بھی مختصراً بیان کیا ہے۔

حیات حافظ حیات حافظ کی تصنیف میں مصنف نے زیادہ تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے۔ جامی کے نفحات الانس تذکرہ دولت شاہ سمرقندی، سفینۃ اولیاء

روضۃ الصفا ۔ حبیب السیر وغیرہ کے علاوہ مغربی مصنفین سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مسٹر براؤن کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا لونسا کی ،، روزگار ڈن آف پرشیا انسائیکلو پیڈیا۔ بڑمانیکا بھر گوراوسلی کے بائیوگرافیکل نوٹس آن پرشیا وغیرہ سے معلومات حاصل کی ہیں۔ روائت اور درایت کا بھی التزام رکھا ہے چنانچہ حافظ شیرازی کے متعلق جتنے بے بنیاد قصے اور روایتیں مشہور تھیں۔ سب سے احتراز کیا ہے۔ بلکہ ایسی روایتوں کو قدیم زمانے میں لوگ صاحبان کمال کی طرف طرح طرح کی روایات منسوب کر دیتے تھے اور خواہ حافظ کو بھی اسی شرف سے نوازا گیا چنانچہ کہتے ہیں۔

ابتدا ہی سے ان کی شاعری انسانی فطرت سے بالاتر سمجھی گئی کسی نے ان کو خضر کا شاگرد بتایا کسی نے ملہم سمجھا کسی نے مجذوب صوفی کہا۔ کسی نے رند مے پرست اور عاشق مزاج ٹھہرایا اور اسی قسم کی طرح طرح کی روائتیں ان کی طرف منسوب کی گئیں سبھی مجلس میں بیان ہونے لگیں۔ ان علمی مکاتبوں میں ان کی زندگی کے اصل حالات اور واقعات کی طرف کسی نے توجہ نہ دی اور زمانے کی موجیں اپنے ساتھ ساتھ ان کو لیتی گئیں ۔

(صفحہ ۳ حیات حافظ)

مصنف نے باری باری تمام مشہور و معروف فرضی روایتوں اور حکایتوں کی نفی کی ہے۔ اول تو عام طور پر خواجہ حافظ کے لئے مشہور ہے کہ ابتدا میں وہ تقریباً بالکل جاہل تھے اور دوسری غلط فہمی وہ ہے جو عام طور پر شاخ نبات کے بارے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا بھی ازالہ کیا ہے عام طور پر شاخ نبات کو۔ خواجہ حافظ کی بازاری محبوبہ کہا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ لغت میں بھی اس کے معنی ایک شیرازی محبوبہ ہی لئے جاتے ہیں۔ لیکن اسلم صاحب نے اس غلط فہمی کو اس طرح دور کر دیا کہ۔

شاخ نبات کے معنی نیشکر ہیں جس سے مراد نرکل کا قلم ہے خواجہ حافظ نے اپنے دیوان میں جا بجا شاخ نبات اپنے ہم قلم کو لکھا ہے۔"

(صفحہ ۱۴ حیات حافظ)

حافظ کی رنگین و شاعرانہ فطرت جس انھوں نے فارس کی آب و ہوا اس وقت کے عام مذاق اور روح عصر کی کار فرمائی بتائی ہے۔ اسی طرح حافظ کے نظریہ حیات کو یعنی کنج خلوت میں ایک گھڑی اطمینان کے ساتھ گزار دینے کو تمام دنیا کی بادشاہی پر جس میں ہزاروں جھگڑے ہوں۔ ترجیح دی ہے۔) جس کو فرار بھی کہا جاتا ہے۔ اسلم صاحب

کے نزدیک ان کے زمانے کی بیدردیاں ۔ ہولناک خوں ریزیاں
زمانے کے انقلاب کا نتیجہ نفیس ۔ کلام پہ مفصل تبصرہ کیا ہے
نمونہ کلام کے لئے علاوہ کلام حافظ سے فال نکالنے کے دلچسپ
موضوع پر بھی اظہار خیال کیا ہے مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ اسلم
صاحب کی لکھی ہوئی حیات حافظ کی دوسری سوانح عمریوں
سے نسبتاً بہتر ہے ۔

کچھ عرصہ سے اردو کے چند سوانح نگاروں کا رجحان سوانح
عمری میں جزئیات کی تحقیق کی طرف ہے اور ان لوگوں کی انتہائی
کوشش یہی ہوتی ہے کہ واقعات کا سراغ مورخانہ نقطہ نظر سے
لگائیں اور جزئیات کو صحیح اور حقیقی شکل میں تلاش کرتے ہیں
یہ لکھنے والے ذاتی تاثرات سے عموماً احتراز کرتے ہیں ۔ ان
لکھنے والوں میں نمایاں اور مشہور مصنفین مہر ۔ اکرام صاحب اور
شیخ چاند ہیں ۔ ان کا شمار اپنے رنگ کے کامیاب مصنفین میں
ہے ۔ غلام رسول مہر صاحب کی مشہور و معروف تصنیف غالب ہے
اور یادگار غالب کے بعد غالب کی یہ دوسری جامع سوانح عمری
ہے ۔ مہر صاحب نے اس سوانح نگاری کو ایک نئے انداز کی
سوانح نگاری سے متعارف کرایا ہے یعنی صاحب سوانح کے
کلام نظم و نثر اور اس کی نجی تحریروں سے اس کے حالات زندگی
فراہم کئے ہیں ۔ جن کی صداقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ۔ اگرچہ

بڑی تحقیق و جستجو مصنف کو اس سلسلے میں کرنا پڑی ہے اور صاحب سوانح کی زندگی کے ہر چھوٹے سے چھوٹے پہلو کو بھی ان کی تحریروں کی روشنی میں جانچا مختلف تحریروں سے اس کا مقابلہ کر کے اس کی صداقت اور اہمیت کا اندازہ کرنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ خود صاحب سوانح کی بھی خوبی ہے اور بقول مولانا عبدالمجید سالک۔

"اگر مرزا غالب ایسے اچھے اور جامع رقعات نہ لکھ جاتے تو مہر صاحب سوانح نگاری میں اتنے زیادہ کامیاب نہ ہوتے۔ لیکن مہر صاحب کا شرف یہ ہے کہ انھوں نے اس مواد سے فائدہ اٹھایا جس کی توفیق مرزا کے عقیدت مندوں میں سے کسی کو بھی نہیں ہوئی"

(دیباچہ از سالک صاحب صفحہ ۷)

مصنف نے بہت ہی معمولی معمولی باتوں کو صاحب سوانح کی متعدد اور مختلف تحریروں سے پیش کیا ہے مثلاً۔ دستنبو، کے سرورق پر وہ نام اور خطاب جس طرح لکھوانا چاہ رہے تھے اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

"نام عرب اور فارسی تحریرات میں جابجا تصریحات ملتی ہیں غالب کی مشہور کتاب "دستنبو" پہلی مرتبہ آگرہ میں منشی شیونرائن آرام کے مطبع مفید خلائق میں چھپی تھی

اور چھپائی کا سارا انتظام منشی ہرگوپال تفتہ منشی نبی بخش حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر کے سپرد ہوا تھا۔ غالب ایک خط میں تفتہ کو دستنبو، کے سرورق کی عبارت کے متعلق ہدایت دیتے ہوئے رقم فرماتے ہیں۔

(صفحہ ۲ غالب)

محض تفتہ ہی کے نام کے خط کی عبارت نہیں درج کی ہے بلکہ اس سلسلے میں جتنے خطوط ہیں اس کا ذکر انھوں نے کیا ہے سب کی عبارتوں کو درج کیا ہے۔

داستان غدر اس کتاب کا اہم حصہ ہے۔ غدر کے متعلق جن لوگوں کے بیانات ملتے ہیں وہ یا تو خود اس میں شریک او ساس۔ کم عامی تھے یا پھر مخالفین اور انگریزوں کے ان کے علاوہ ان بڑے بوڑھوں کے بیانات بھی ہیں جن کے متعلق یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ زیب داستاں کے لئے کچھ بڑھا چڑھا کر بھی بیان کیا ہوگا۔ غالب نہ تو اس ہنگامے میں شریک تھے اور نہ وہ ان مظالم کو نظر انداز کر سکتے تھے۔ جو انگریزوں نے دہلی والوں خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ روا رکھے تھے۔ وہ ان ہنگاموں سے الگ شہر کی اس بربادی اور ویرانی کو بڑی مبصرانہ نظروں سے دیکھتے رہے اور اس کا اظہار اپنے پردیسی احباب و شاگردوں کے خطوط میں بڑے سوز متانت اور غیر جانب دارانہ انداز سے کرتے رہے ان کو اس کا جو صدمہ تھا اس کا احساس

مصنف نے ان کی تحریروں سے کیا ہے اور لکھتے ہیں۔

اس جلیل القدر انسان کے اندوہ و غم اور فریاد و ماتم کے توسط و عروج کا لفظ بہ لفظ نہایت سلطنت مغلیہ کی تاریخ کا زوال کا وہ خوں ریز و خوں چکاں واقعہ محفوظ ہے جو عام طور پر غدر کے نام سے معروف ہے۔

(صفحہ ۱۷۰)

اس واقعہ کو مصنف نے مرزا صاحب کی تمام تحریروں اور اشعار سے بڑی محنت اور توجہ کے ساتھ مجتمع اور مربوط کیا ہے۔ چونکہ یہ تمام کے تمام واقعات ان کی ان نجی تحریروں سے اخذ کئے ہیں جو انھوں نے بلا ارادہ تحریر کی تھیں اس لئے یہ صاحب سوانح کی ہی شخصیت میں پیوست نظر آتے ہیں غالب کی اس سوانح عمری کے ذریعہ نہ صرف غالب کے متعلق واقعات انتہائی صحت کے ساتھ باعتبار سنہ و تاریخ ہم تک پہنچتے ہیں بلکہ غالب کے خاندان کے دوسرے افراد کے بارے میں بھی بہت کچھ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کے عہد کے تمام واقعات اور حالات اور ان کا لوگوں پر خصوصاً غالب کی زندگی پر اثر خود غالب کی زبانی یا یوں کہئے کہ غالب کے قلم سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت کے تمام ممتاز اور نمایاں لوگوں سے شاہی خاندان کے بعض افراد کے متعلق کم بہت سی دلچسپ اور اہم معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح یہ نہ صرف غالب بلکہ پورے دور کی بڑی کی سچی اور واضح تصویریں

جاتی ہے جس کے یقین کرنے میں تامل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مہر صاحب کی یہ تصنیف سوانح نگاری سے زیادہ تاریخی اعتبار سے اہم ہے اور یہ تاریخی اور سوانحی عناصر سے مرکب ہے۔ اگرچہ مہر صاحب نے اپنے دیباچے میں ایک جگہ لکھا ہے

"یادگار اپنی تمام خوبیوں کے باوجود غالب کی صحیح مفصل اور مستند سرگزشت حیات نہیں۔"

(صفحہ ۱۱)

تاہم انھوں نے اپنی تصنیف کی تکمیل میں جا بجا کثرت سے مولانا حالی کے حوالوں سے کام لیا ہے۔ اور ان کی تصنیف میں بھی اس سوانحی تسلسل کی کمی محسوس ہوتی ہے جس کی شکایت یادگار غالب سے کی جاتی ہے۔

جس طرح مہر صاحب نے خطوط کلام اور تحریروں سے غالب کی تاریخی سوانح عمری مرتب کی ہے اسی طرح شیخ محمد اکرام نے شبلی کے مکاتیب اور کلام سے ان کی نفسیاتی سیرت نگاری کی کوشش کی ہے جو ایک حد تک کامیاب سیرت نگاری کہی جا سکتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایک چیز یہ محسوس ہوتی ہے کہ اکرام صاحب نے باوجود صاحب سیرت کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی اپنی سیرت نگاری کی بنا کسی شدید جذبہ کے ماتحت رکھی ہے جس کو مخالفت ہی کہا جا سکتا ہے ان کی سیرت نگاری کا عام انداز اور رجحان ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب سیرت کی قلعی کھول دینا چاہتے ہیں

خواہ وہ سید سلیمان ندوی کی ان بے جا تاویلات کی تردید کرنا چاہتے ہوں جو انھوں نے حیات شبلی کے ہیرو کی حمایت میں پیش کی ہیں اور خواہ عطیہ بیگم سے ان کی خط و کتابت اور ان کے متعلق ان کے جذبات کو ایک نئی روشنی میں پیش کرنا چاہ رہے ہوں ان کا انداز کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی گندم نما جو فروش کا پول کھول رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اکرام صاحب نے بھی اردو کو نفسیاتی و تجرباتی سیرت نگاری سے روشناس کرایا ہے۔ وہ جو سیرت نگار کے متعلق کہتے ہیں۔

"تمام واقعات کا احاطہ کرنے کے بعد وہ دریا کو کوزے میں نہیں ایک ایسے جام بلوریں میں پیش کرتا ہے۔ جس کے اندر سے صاحب تذکرہ کی شخصیت صاف جھلکتی ہے۔"

(دیباچہ شبلی نامہ)

اور انھوں نے خود بھی یہی کوشش کی ہے بہرحال یہ چھوٹی اور مختصر سی سوانح تو گیا سیرت و شخصیت نگاری۔ مولانا شبلی یا بقول شیخ صاحب ایک فنکار کی داستان حیات ہے جو ہمارے اس فنکار اور اردو ادب کے عناصر خمسہ میں سے ایک رکن کی بوقلموں اور حل طلب فطرت کے ایک ایسے پہلو پر روشنی ڈالتی ہے جس کو آشکار کرنے سے سید سلیمان ندوی کا سعادت مند قلم قاصر رہا ہے اور اس کمی کی اکرام صاحب کو سید صاحب سے سخت شکایت ہے۔ "شبلی نامہ" میں اکرام صاحب نے سید سلیمان ندوی کے بعض بیان پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ سب سے بڑھ کر ایک باقاعدہ باب "وا دی گل"

کے نام سے مرتب کیا ہے جس میں انھوں نے مولانا شبلی اور عطیہ بیگم فیضی کی موانست اور خط و کتابت میں ایک پہلو دیکھا اور یہ نتیجہ نکالا کہ :

"انسانی فطرت ایک بڑی پیچیدہ اور جامد چیز ہے۔"

انھوں نے یہ صرف عطیہ بیگم فیضی کے مجموعہ خطوط اور ڈائری سے استفادہ کیا ہے بلکہ اس بارے میں شبلی کے ان خطوط کے حوالے بھی دیئے ہیں جو انھوں نے اپنے بے تکلف دوستوں کے نام لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ان غزلوں کے مجموعے سے جس کا نام "دستۂ گل" ہے بعض اشعار کے حوالے دیئے اور ایک رنگین طبع شاعر کے کلام کی حیثیت سے اس کو داد بھی دی ہے۔

"دستۂ گل صحیح معنوں میں پھولوں کا ایک گلدستہ ہے اور پھول بھی ایسے جن کی شادابی اور خوبی رنگ و بو کا ہندوستان کی فارسی شاعری میں جواب نہیں۔ یہ غزلیں الفاظ کے انتخاب خیالات کی تازگی اور طرز ادا کی شستگی میں ترشے ہوئے ہیرے ہیں۔ لیکن جذبات کی شدت دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبردست طوفانی دریا ہے جو مدتوں اینٹ پتھر کے ایک بند سے ٹکراتا رہا ہے اور اب بند توڑ چکا ہے اور پورے زور شور سے بہہ رہا ہے۔"

شبلی نامہ

مندرجہ بالا طویل اقتباس سے خصوصاً خط کشیدہ سطور سے ہم

بخوبی یہ مطلب اخذ کر سکتے ہیں کہ شبلی کے کلام پر تنقید کا مطلب ان کی فطرت کے بدلتے ہوئے دھارے پر روشنی ڈالنا ہے۔ اور ان چند الفاظ میں انھوں نے صاحب سیرت کی فطرت کے دو متضاد رخوں اور کیفیتوں کی پوری داستان سنا دی ہے۔ اس کے علاوہ شبلی کے اس شعر سے

آں شمائے دوست کی دو رنداوہ بہ بینی باتم

کہ دم او صحبتے... آں دشمن ایمان شدہ ام

میں دشمن ایمان کا اشارہ عطیہ بیگم ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں اور سید سلیمان ندوی کے اس بیان کی سختی سے تردید کرتے ہیں کہ

"وہ لوگ جن کی سخن فہمی صرف حرفی ہے وہ غلطی سے اس دشمن ایمان کی تلاش بمبئی میں کرتے ہیں حالانکہ وہ علی گڑھ میں تھا یعنی وہ علی گڑھ کی تحریک سے الگ ہو کر ندوے میں شامل ہو گئے"۔

وسنہ رنگ کے علاوہ خطوط شبلی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"خطوط شبلی مشرقی ادب میں ایک بالکل انوکھی چیز ہے بظاہر تو یہ چند صفحات کا مختصر سا رسالہ ہے لیکن ان چند صفحات میں محبت کا مکمل ڈرامہ آگیا ہے"۔

(شبلی نامہ)

شبلی کا اردو کے بہترین مکتوب نگاروں میں شمار ہوتا ہے اور ان کے خطوط انشا پردازی اور ایجاز کے نہایت خوشگوار نمونے ہیں لیکن

شبلی کی احتیاط قلم سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا جس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے اپنا مقام اور مرتبہ بہت پہلے سمجھ لیا تھا۔ لیکن اس پر بھی اکرام صاحب نے اسی محتاط قلم کے شواہد فراہم کر دیئے۔ لیکن انھوں نے ان کے خطوط کے اقتباسات محدود سے چند ہی دیئے ہیں اور یہ کہنا ہی بہت جاتا ہے کہ

> ہم خطوط شبلی کے طویل اقتباسات نہیں دینا چاہتے جس کسی کو انسانی نفسیات، ادب یا شبلی کی ذات سے دلچسپی ہو گی وہ خود اس گلستاں کی سیر کرے گا۔"
>
> (شبلی نامہ)

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر نفسیاتی حقیقت کے بیان کے لئے ایک خاص تسلسل اور ترتیب کی ضرورت ہے محض تنقیدی دلائل ہی کافی نہیں ہوتے ہم کسی شخص کے متعلق صاحب سیرت کے جذبات نفرت یا محبت کا محاکمہ اسی وقت کر سکتے ہیں۔ جبکہ اس کے خطوط اور دوسرے وسائل سے ہم کو ان حالات اور واقعات سے کلی واقفیت نہ ہو جائے جن کی بنا پر پسند و ناپسند کا سوال پیدا ہوا۔ اور چونکہ مصنف نے ان طویل اقتباسات کے دینے سے انکار کر دیا ہے جن سے ان کے دعوی کی صداقت کا یقین ہوتا اور قاری کو تسکین ہو جاتی بلکہ وہ اس کی تسکین اور اطمینان کے لئے اس کو خطوط شبلی کے مطالعہ کی ہدایت کر دیتے ہیں۔ اس لئے کتاب کا یہ پہلو کمزور اور ناقص کہا جا سکتا ہے۔

عطیہ بیگم فیضی کے قصہ کے علاوہ شبلی کی نثر اور سوانحی تصانیف پر تنقید و تبصرے کو بھی جگہ دی ہے۔ اور ان کے اسلوب و طرز نگارش کو بھی ان کی نفسیات اور افتاد طبع کی روشنی میں جانچا اور پرکھا ہے اسی طرح ان کے آخری ایام حیات کی مشکلات و مصائب پر بھی اسی زاویہ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ اور بتایا ہے کہ ان حالات اور واقعات میں اتفاقات کا جس قدر ہاتھ تھا اسی قدر خود شبلی کی افتاد مزاج کا بھی دخل ہے۔ ان کے زاویہ نظر سے شبلی ایک دلچسپ اور عبرتناک نفسیاتی موضوع ہیں۔

"شبلی کی زندگی میں عبرت اور نصیحت کا بڑا سامان ہے ان کی سیرت میں دو ایک چیزیں کھٹکتی ہیں۔ لیکن اگر انھیں ایک کمزور صحت اور کمزور اعصاب والے انسان کی فروگزاشتیں سمجھ کر یا علم و ادب کے ایک صیقلی آئینہ کا زنگار خیال کرکے نظر انداز کردیں تو دیکھنے والے کو شبلی کی زندگی میں قابلیت، ایثار۔ بلند ہمتی مسلسل جد و جہد بخت کاری حب۔ قومی۔ دینداری و منزلت صفا۔ دولت کی بے قدری نفاست پسندی اور تنظیم اوقات کے بڑے کار آمد سبق ملتے ہیں۔"

(شبلی نامہ)

اکرام صاحب نے اپنی اس تصنیف میں مندرجہ بالا سطور کو جگہ دے کر اپنی سیرت نگاری کو ایک بڑے نقص اور اعتراض سے

بچا لیا ہے ورنہ ان پہ یہ اعتراض عائد کرنے کی گنجائش نکل سکتی تھی کہ

"راست نگاری اور حق گوئی کا یہ مطلب نہیں کہ آزادی رائے کو بے لگام چھوڑ دیا جائے۔ اور موضوع سیرت کے متعلق تعصبات رکھ کر اس کی بعض کمزوریوں پر لعنت ملامت کی جائے یا اس کو غلط رنگ میں پیش کیا جائے۔ بہر حال "شبلی نامہ" اردو سوانح نگاری میں ایک نیا اور دلچسپ اقدام ہے۔"

شبلی نامے کے علاوہ اکرام صاحب نے غالب کے حالات زندگی بھی "غالب نامہ" کے نام سے تحریر کئے ہیں جس میں ان کا طریق کار وہی ہے جو غالب میں غلام رسول مہر صاحب کا ہے۔ غالب نامہ کے دیباچہ میں اکرام صاحب اپنا مقصد یہ بیان کرتے ہیں کہ

"مرزا کا ایسا تذکرہ مرتب کرنا تھا جس میں واقعات بلحاظ وقوع کی ترتیب سے درج ہوں۔"

(صفحہ، غالب نامہ)

اگرچہ اس وقت غالب کے کئی تذکرے لکھے جا چکے تھے۔ لیکن اکرام صاحب نے ایک نئی راہ ڈھونڈھ نکالی۔ عام تذکرہ نگاروں نے زیادہ تر فارسی خطوط کو نظر انداز کر دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے فارسی خطوط سے مواد اخذ و مرتب کرنا شروع کیا۔ علاوہ تاریخی ترتیب کے اکرام صاحب نے ایک اہتمام یہ بھی کیا ہے کہ غالب کی زندگی کے تمام

مراحل اور ذہنی نشوونما۔ ان کے کلام کے ارتقائی مدارج کو تاریخی اور سیاسی حالات کے پیش نظر پیش کیا ہے اس طرح غالب کی سوانح حیات کے ساتھ ہی ساتھ اس عہد اور انقلاب کی تاریخ بھی مرتب ہوتی جاتی ہے۔ جس نے بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طرح ان کے موضوع کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو متاثر کیا ہے۔ انھوں نے غالب کی زندگی کے ہر پہلو پر بڑی صائب اور سنین کے لحاظ سے روشنی ڈالی ہے اور لطف یہ ہے کہ بے جا طوالت کا شکار نہیں ہوتے ہیں۔

ان کے کلام پر تبصرہ بھی بالکل نئے انداز میں کیا ہے۔ اس سے پہلے کلام غالب پر اس ترتیب اور لحاظ سے تبصرہ نہیں کیا گیا تھا غالب کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے اور پھر دکھایا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات تاریخی اور سیاسی و ملکی انقلابات کس طرح ہمارے فنکار کے فن کو تدریجاً متاثر کرتے رہے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی دکھایا ہے کہ اس کا اپنا مزاج عادات و خصائل کس طرح اس کے فن میں دخیل تھے۔ غرض یہ کہ یہ تبصرہ بھی اپنے طرز کا نیا تبصرہ ہے اور غالب نامہ مطالعۂ غالب کے لئے بڑی اہم کتاب ہے۔

تحقیقی اور تاریخی نقطہ نظر رکھنے والے سوانح نگاروں میں ایک ممتاز اور نمایاں نام شیخ چاند مرحوم کا ہے۔ اگرچہ شیخ چاند کو باضابطہ طور پر سوانح نگار کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ

مصنف نے اپنی مایہ ناز تصنیف "سودا" سوانح نگاری کے نقطہ نظر سے نہیں لکھی تھی بلکہ عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل کرنے کے لیے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مقالہ تیار کیا تھا۔ اور انھوں نے سودا پر ریسرچ کی تھی۔ یہ مقالہ ہر لحاظ سے مکمل اور اہم ہے۔ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ان کے اس مقالے کی جانچ کی تھی اور ان کی اس بارے میں رائے ہے کہ

"پورے مقالے کے مطالعہ کے بعد میری یہ پختہ رائے ہے کہ شیخ چاند صاحب مقالہ نگار نے فراہمی مواد مطالعہ بحث اور ترتیب و بیان مطالب میں پوری کاوش اور محنت کی ہے اور اس طرح پوری تیاری کے بعد مقالہ لکھا ہے۔"

اس کتاب کے چار حصے ہیں۔ تمہیدی جس میں سودا کے تاریخی و معاشرتی ماحول سے بحث کی ہے جس کا اثر سودا کی شاعری پر پڑا اور یہ بھی دکھایا ہے کہ جس وقت سودا نے شاعری کا آغاز کیا ہے تو اردو شاعری کی کیا حالت تھی۔

دوسرے حصہ میں سوانح حیات کلام و تصانیف پر تحقیق بحث ہے تیسرا حصہ تنقیدی ہے اس میں سودا کی شاعری سے بحث کی گئی ہے اور یہ کہ ان کا اردو شعراء میں کیا درجہ اور مقام ہے۔ چوتھے اور آخری حصے میں اس امر پر بحث ہے کہ سودا نے زبان

کے بنانے میں کیا کام کیا اور ان کا ہمارے ادب میں کیا مقام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت کم کتابیں اس تحقیق و تلاش اور محنت کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنے مواد اور معلومات کا ماخذ زیادہ تر تین چیزوں کو بنایا (۱) معاصرین کے تذکرے (۲) خود مرزا سوداؔ کے کلام کو (۳) وہ ہجویات جو سوداؔ کی شان میں میر صاحب اور دوسرے شعراء نے لکھیں اور اس کے علاوہ انھوں نے قیاس اور قرائن سے بھی نتائج نکالے ہیں مثلاً سوداؔ کے بچپن کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن انھوں نے قیاس سے بہت کچھ کام چلا لیا۔

"کابلی دروازے کے علاقہ میں گھر تھا۔ جہاں سوداؔ کا بچپن گزرا اس گھر کا ایک بڑا پھاٹک تھا۔ جس میں آگے چل کر سوداؔ کی نشست رہنے لگی تھی۔ وہ دروازہ تباہی دہلی میں تباہ ہوا۔ اس کے بچپن کے حالات ابھی تک پردۂ اخفا میں ہیں لیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ بچپن میں کسی قدر تیز اور شوخ ہوگا۔" (صفحہ ۳۰ سوداؔ)

ان کا فوج میں ملازمت کرنا اور پھر جلد ہی اس سے سبکدوش ہو جانے کا حال بھی ان کے ایک قصیدے کے اشعار سے ہی لیا ہے لکھتے ہیں۔

"خود سودا نے اس قصیدے میں جو حضرت علی کی منقبت میں لکھا ہے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔"

(صفحہ ۳۷ سودا)

ساتھ ہی وہ اشعار بھی درج کئے ہیں۔ اسی طرح ان کی شاعری کے زمانہ کی صحیح تاریخ کے تعین کے لئے جہاں انھوں نے مختلف تذکروں اور مولانا محمد حسین آزاد کے بیانات کی روشنی میں صحیح تاریخ کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے وہاں خود ان کے کلام کی شہادت سے بھی کام لیا ہے۔

"لیکن سودا کے ایک داخلی بیان سے ثابت ہے کہ وہ فارسی میں طبع آزمائی کو تضییع اوقات سمجھتے تھے۔ اس کا ایک قطعہ ہے جس میں فاخر مکین پر طنز کرتے ہوئے ایک فارسی داں کا قول بیان کیا ہے"

(صفحہ ۴۰ سودا)

جیسا کہ گذشتہ سطور میں ذکر آچکا ہے کہ شیخ چاند مرحوم نے ان ہجویات سے جو سودا کی شان میں کہی گئیں نفیس واقعات کا کھوج لگایا ہے چنانچہ وہ سودا کی کتوں سے دلچسپی اور ان کو پالنے کا شوق بیان کرتے ہوئے میر صاحب کی ہجو کا حوالہ دیتے ہیں اور اسی طرح اس کا ہجو کا بھی حوالہ دیا ہے جو خود سودا نے لکھی تھی۔

"سودا کو کتے پالنے کا بڑا شوق تھا ابریشمی بال والے

کتے پالتا تھا۔ فدوی لاہوری کی ہجو میں جو ترجیع بند لکھا ہے اس میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(صفحہ ۷۷ سودا)

اس کے علاوہ ان کے کتے پالنے کا شوق اور کتوں کے متعلق تفصیلات کا پتہ انھوں نے اس ہجو سے لگایا ہے جو میر صاحب نے خود سودا کی شان میں لکھی تھی۔

"میر صاحب کی لکھی ہوئی ہجو سے پتہ چلتا ہے کہ سودا کو کتوں سے بڑی الفت تھی اچھے بال والے کتے پالتا تھا۔ اور ان کو پیار محبت سے رکھتا تھا وغیرہ وغیرہ"

ساتھ ہی وہ اشعار بھی درج کر دیئے ہیں جن میں کتوں کے متعلق تفصیل ملتی ہے

پہلے حصہ میں انھوں نے اس سیاسی اور سماجی ماحول اور کیفیت کا مفصل اور مشرح جائزہ لیا ہے جس میں سودا کی شخصیت اور فن کی تشکیل ہوئی۔ پھر تنقیدی حصے میں اس سیاسی اور سماجی پس منظر سے روشنی ڈالی ہے اور دکھایا ہے کہ سودا کا فن اس وقت کے سیاسی اور سماجی تقاضوں کی کس طرح ترجمانی کرتا ہے۔ ان کی ہجویات اور شہر آشوب پر تنقید کرتے ہوئے سودا کے مزاج پر اس وقت کے انتشار بد امنی اور ابتری کا رد عمل کیا ہوا۔ اس کا تجزیہ بڑی اچھی طرح کیا ہے اور جا بجا اشعار کے حوالوں سے اس

وقت کے حالات کو پیش کیا ہے۔ یہ تصنیف ادبی سوانحی اور تنقیدی تقاضوں کو بڑے خلوص متانت اور فنی پختگی کے ساتھ پورا کرتی ہے۔ مولوی احتشام الدین صاحب دہلوی نے اس کتاب کا قطعہ تصنیف کہا ہے اور اس میں ان کی تصنیف کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ بڑی جامع اور مکمل ہے۔

تحریر منجیانہ تو تقریر منطقی
طرزِ مؤرخانہ سراسر بیان میں
آزاد شبلی حالی و شروانی کے سب تیر
مارے ہدف پہ رکھ کے ہلالی کمان میں

سودا کی شخصیت حالات اور فن کے بارے میں اس سے بہتر کتاب تصنیف میں نہیں ہو سکتی شیخ چاند نے انتہائی تحقیق و تلاش سنجیدگی اور سوجھ بوجھ کے بعد ہمیں ایک ایسے شخص سے متعارف کرایا ہے۔ جس کے کلام کے علاوہ اس کے زندگی کے بیشتر حالات تاریکی اور لاعلمی میں تھے۔

جدید لکھنے والوں نے ایک بالکل نئے طرز کی سوانح یا زیادہ مناسب الفاظ میں سیرت نگاری میں ذاتی تاثرات کی آمیزش سے مختلف شخصیتوں کو پیش کرنا شروع کیا ہے جن میں اکثر خارجی جزئیات کی ترتیب پر زور دیتے ہیں۔ واقعات زندگی کم اور ذہنی زندگی زیادہ صراحت سے بیان کرتے ہیں ان میں مولوی عبدالحق

رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی کے نام نمایاں نظر آتے ہیں

چند ہم عصر بابائے اردو کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے گذشتہ پچاس سال میں اپنے ہمعصروں کے متعلق وقتاً فوقتاً لکھے تھے اوران کوان کے ہونہار اور لائق شاگرد شیخ چاند مرحوم نے یکجا کر لیا تھا ان مضامین میں بعض ایسے بھی ہیں جو کسی ہمعصر کی وفات پر لکھے گئے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو کسی ماتمی جلسہ کی تقریر کے لئے لکھے گئے تھے۔ مثلاً سید محمود ایسے ہی موقع پر لکھا گیا تھا۔

سرسید احمد خاں پر جو مضمون لکھا ہے وہ دلچسپ اور پر از معلومات ہونے کے علاوہ ان کی سیرت کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے جو اس سے پہلے اور کہیں نظر نہیں آتے۔ مثلاً انھوں نے بوہنارم کے مسٹر تھیوڈر بیک کا اختلاف اور رنگ برنگی لباس اور پگڑیوں کے رائج کرنے کی کوشش کے خلاف جو اقدام کیا جو دلیرانہ اور بے لاگ تقریر کی تھی اس کا اپنے مضمون میں ذکر کر کے سید پر سے انگریز پرستی کا غیر منصفانہ اور بے جا الزام دور کر دیا۔ اگرچہ مولوی صاحب نے کسی طرح ارادۃً یہ الزام دور کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ لیکن اس واقعہ کا ذکر اور اس تقریر کو درج کر دیتے ہی سے سرسید کی شخصیت اور سیرت کا ایک بالکل نیا پہلو سامنے آگیا۔ اور یہ عظیم انسان عظیم تر نظر آنے لگا سرکار پرستی اور انگریزوں کی خوشامد کے الزامات کا جو مورچہ سرسید کے خلاف زور شور سے تیار کیا گیا تھا اور جس کے باعث سرسید کے پرجوش

حامیوں کو بھی اکثر سر جھکا لینا پڑتا تھا۔ محض اس معمولی سے واقعہ کو بڑی سادگی سے بیان کر دینے سے ریت کی بے بنیاد عمارت کی طرح ڈھے گیا

بعض مرتبے مولوی صاحب نے بڑی نفاست سے کھینچے ہیں جو دلکش بھی ہیں۔ مثلاً سرسید راس مسعود کی بڑی اچھی تصویر پیش کی ہے۔ انداز تحریر سے بوئے محبت آتی ہے۔ اور ان الفاظ میں اپنے بہت پیار سے عزیزوں ہی کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مسعود مولوی عبدالحق صاحب کے آگے کے بچے تھے۔ یہاں تک کہ ان کو مسعود کی تقریب بسم اللہ بھی یاد ہے اور سرسید کا ان کو اپنی بھاری اور گنجیلی آواز میں لوریاں دینا بھی یاد ہے۔ لیکن اس بہت چھوٹے بچے کی شخصیت اور وجاہت کو انھوں نے بڑے دلکش پیرائے میں پیش کیا ہے۔ مسعود کی شخصیت کے دل سے قائل ہیں۔ ان کی ہر بات ان کو بھلی معلوم ہوتی ہے وہ ان کی کمزوریوں کا ذکر بھی محبت بھرے لہجے میں کرتے ہیں۔

"مسعود میں مقابلے کی قوت مطلق نہ تھی وہ بڑے ذکی الحس تھے اور ذرا سی مخالفت میں پریشان ہو جاتے تھے خاص کر جب کسی دوست کی طرف سے مخالفت ہوتی تھی تو انھیں بڑا صدمہ ہوتا تھا۔ اس میں وہ بہت مبالغہ کرتے تھے اکثر عقل پر جذبات غالب آجاتے تھے" (چند ہمعصر ۱۶۳)

نام دیو مالی اور میرن صاحب یہ دونوں مضمون اس امر کے شاہد ہیں کہ ایک شخصیت یا سیرت نگار کو ہر انسان میں کچھ ایسی خصوصیت

نظر آجاتی ہے کہ وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ چونکہ اس شخصیت نگاری کی بنا مصنف کے اپنے تاثرات پر ہوتی ہے اور یہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ اصل شخص کیا تھا۔ اور دوسرے اس کو کس نظر سے دیکھتے تھے بلکہ اس میں مصنف اپنا زاویہ نظر پیش کرتا ہے اور یہ دکھاتا ہے کہ وہ شخص مصنف کی نظر میں کیا مقام رکھتا ہے۔ چنانچہ مولانا محمد علی مرحوم جن کے بارے میں رشید احمد صدیقی صاحب کے تاثرات یہ ہیں۔

"محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں یہ تنگ نظروں کا فیصلہ ہے مرد غازی کے کارنامے کا اندازہ مقبوضات کی وسعت مال غنیمت کی فراوانی جشن وجلوس کی ہماہمی وطرب انگیزی نغمہ اور اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ ٹوٹی ہوئی تلوار بکھری ہوئی زرہ بہتے ہوئے لہو دمکتی ہوئی روح اور دمکتے ہوئے چہرے اور ڈوبتے ہوئے سورج سے" (گنجہائے گراں مایہ صفحہ ۸)

مولوی عبدالحق کی چند ہمعصر میں ایک دوسرے ہی روپ میں نظر آتے ہیں ان کی نظر میں محمد علی ان خصوصیات اور اوصاف سے عاری ہیں جو کسی شخص کو بڑا آدمی بناتے ہیں۔

گنجہائے گراں مایہ بھی اسی قسم کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن میں ان تاثرات اور جذبات کا اظہار

کیا گیا ہے جو ان شخصیتوں کے بارے میں مصنف اپنے ذہن میں رکھتا ہے۔

یہ مضامین ان رفتگان کی یاد میں ہیں جو رشید صاحب سے کسی نہ کسی طرح ذہنی اور جذباتی طور پر متعلق رہے تھے، اور رشید صاحب نے سالہا سال ان کی پرلطف و بے تکلف صحبتوں میں گزارے ہیں اور ان کے نیک و بد سے بھی واقف رہے ہیں ان میں سے بعض کے ساتھ ان کے تعلقات اس انتہا کو پہنچ چکے تھے کہ ان کی تکلیف یا رنج رشید صاحب کے لئے ناقابل دید اور ان کی برداشت سے باہر ہوتا تھا۔ اور ان کو ایسے ان اشخاص کی کمزوریوں سے بھی الفت تھی۔

گنجہائے گراں مایہ میں سے ہم کو یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ اس کے اشخاص نے کیا کارنامے کئے یا کون سی علمی یا ادبی خدمات انجام دیں۔ اور یہ بھی پتہ نہیں چلایا جا سکتا کہ رشید صاحب کے موضوعات کہاں پیدا ہوئے اور کب پیدا ہوئے۔ ان کے باپ دادا کون تھے ان کی تعلیم و تربیت کیسی ہوئی اور کہاں تک انھوں نے یہ جاننے اور بتانے کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔ بلکہ انھوں نے تو جس طرح ان کو دیکھا اور پایا وہی تاثرات پیش کر دیئے۔ ان کو بس اتنا سروکار ہے کہ یہ افراد جب خود ان کی زندگی میں داخل ہوئے تو وہ ان کو کیسے لگے یہ بالکل عام انسان تھے جو ہنستے بولتے چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے تھے۔ مسرور بھی ہوتے تھے اور دلگیر بھی ہو جاتے تھے۔ لیکن مصنف کو ان کی اپنی روزمرہ کی معمولی اداؤں میں بڑی خصوصیت

اور دلکشی نظر آتی اور اس کو انھوں نے اسی انداز سے پیش کر دیا ان مختصر اور چھوٹے چھوٹے مضامین سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کے ساتھ مصنف کے کیسے تعلقات تھے اور کون ان کو کس درجہ عزیز تھا۔ مصنف نے اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ اس کے اشخاص کی کون سی بات قاری کو پسند یا ناپسند ہوگی ان کے متعلق جو کچھ جانتے تھے بے کم و کاست لکھ دیا ہے۔ وہ ان کے عیب تھے یا محاسن بہر حال وہ مصنف کو عزیز تھے مصنف کا قاری سے یہ مطالبہ ہرگز نہیں کہ وہ ان کے تاثرات اور خیالات سے متاثر ہو یا اتفاق کرے بلکہ وہ تو محض صفحہ قرطاس پر ان نقوش کو ثبت کر دینا چاہتا ہے۔ جو اس کی اپنی نظر میں دلکش تھے۔ وہ ان کی یاد کو ابدیت عطا کرنا چاہتا ہے جو زندگی میں ان کو عزیز تھے اور جدا ہو کر عزیز تر ہو گئے۔ وہ اگر مولانا سلیمان اشرف کی یہ عادت بیان کرتے ہیں کہ وہ ہر کس و ناکس کو علمی گفتگو کا مستحق نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کو بری طرح ٹوک کر خاموش کر دیتے تھے تو ان کو اس سے سروکار نہیں کہ پڑھنے والے کی نظر میں ان کے ہیرو کی یہ ادا مستحق ہوگی یا نہیں ان کو تو بس یہ ادا قابل قدر معلوم ہوئی اور انھوں نے ذکر کر دیا۔ اب یہ ان کے قلم کا جادو ہے کہ پڑھنے والا انہی کے جذبات کی رو میں بہنے لگتا ہے۔ وہ مسکراتے ہیں یا کسی واقعہ سے لطف لیتے ہیں تو قاری بھی لطف اندوز ہوتا ہے اور مسکرا پڑتا ہے اور جب وہ دلگیر اور محزون ہوتے ہیں تو قاری کا دل بھی بھاری ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں بھر آتی ہیں گلا رندھ

جاتا ہے اور جب رشید صاحب کہتے ہیں۔

"یہیں سے وہ آج ہر شوق سے رخصت ہو رہے تھے وہ شخص جو دوسروں کے لئے سہارا تھا آج ہر سہارے سے بے نیاز ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں جن میں زندگی خلوص اور سرداری کی چمک تھی بے نور ہونے لگی تھیں جس چشمہ سے ہم اور کتنے تقویت اور بشاشت حاصل کرتے تھے وہ خشک ہو رہا تھا ہمیشہ کے لئے خشک ہیں بیٹھا رہا مرحوم کی حالت دیکھ کر طبیعت بے اختیار ہونے لگی جی چاہتا کاش مولانا یک لخت تندرست ہو کر بیٹھ جاتے اور کتنے خوب آئے بیٹھو گپ ہو گی۔ کدوا ہے بڑا ہو گیا ناچے گا نہیں۔ ہاں کہا وہ ایک مجھے بھی دنیا میری وہ حالت تھی جب آدمی دعا نہیں مانگتا وہ سمجھتا ہے دعا مانگنا عبث ہے وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ہر چیز دگرگوں ہو جائے۔" (گنجہائے گرانمایہ صفحہ ۷۵)

تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تمام دلی جذبات نثاری کے دل میں سما گئے تھے۔ رشید صاحب کے اختصاص کا اور ہمارا ساتھ چند منٹوں کا ہوتا ہے وہ بھی رشید صاحب کی وساطت اور اجازت سے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کے ساتھ برسوں رہے ہیں اور ان کی کمی ہمیں بڑی طرح محسوس ہوتی ہے۔ مولانا سلیمان اشرف ہوں یا اصغر ایوب

ہوں یا مولانا ابوجراکی موت اور جدائی ہمیں شاق گذرتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا اور انکا برسوں کا ساتھ چھوٹ گیا وہی ویرانی وہی خلا اور تنہائی محسوس ہوتی ہے جو کسی ہمدم دیرینہ کی صورت پر ہم محسوس کرتے ہیں۔ ان کے اشخاص مولوی ہوں یا شاعر پروفیسر ہوں یا ڈاکٹر ان میں بڑی دلکشی ہے۔ اور وہ مولوی پروفیسر ڈاکٹر یا شاعر نہیں نظر آتے بلکہ انسان بھولا بھالا معصوم لیکن عظیم و دلکش انسان نظر آتے ہیں بہت سی باتیں وہ خود نہیں کہتے لیکن قاری سے اپنے دل کی بات منوا لیتے ہیں مثلاً مولانا ابوبکر کے متعلق انھوں نے نہیں کہا کہ وہ مکمل انسان تھے مرد مومن تھے چٹان کی طرح خاموش و مستحکم تھے لیکن تمہارے گراں مایہ کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے جذبات نگار بھی ہیں۔ وہ ہنسانا تو جانتے ہی ہیں لیکن رلانے میں بھی کمال رکھتے ہیں۔

اس سلسلہ میں شوکت تھانوی کی شیش محل کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے یہ ادبی شخصیتوں کے مزاحیہ مرقعے ہیں۔ شوکت تھانوی مزاح نگار ہیں اور انھوں نے ان ادبی اور ثقہ ہستیوں کی شخصیتوں کو جنھیں ہم نامور ادیبوں اور شاعروں کی حیثیت سے جانتے ہیں مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ہم ان بڑے اور نامور ادیبوں کی زندگیوں کے بعض ایسے دلچسپ پہلوؤں سے واقف ہو جاتے ہیں جو ان کی شخصیت کا ایک ضروری جز ہوتی ہیں اور ہم ان کو پڑھ کر مسکرا اٹھتے ہیں۔ شوکت تھانوی نے اپنی کتاب

"ان حضرات کے نام جو اپنا تذکرہ پڑھ کر خفا نہ ہو جائیں۔"

معنوں کی ہے۔ یہ ان لوگوں کا تذکرہ ہے جن سے مصنف کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی صورت میں مل چکے ہیں۔ اس کے متعلق انھوں نے خود لکھا ہے

"یہ تذکرہ کسی مورخ کے کام آنے والی چیز نہیں ہے اس لئے کہ ادبی حالات سے بحی حالات پیش کئے گئے ہیں اور وہ بھی ایسے کہ انکے غلط ہونے کا احتمال صحیح ہونے سے کہیں زیادہ ہے۔"

(شیش محل صفحہ ۹)

اس میں بھی انہیں تاثرات کا ذکر ہے۔ جو مصنف کے دل میں ان شخصیتوں کے لئے پیدا ہوئے۔ انھوں نے اسکی صداقت اور مسلم ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔

"میں نے اپنے نزدیک اپنی ایماندارانہ رائے کا اظہار کیا ہے مگر مجھے خود نہیں معلوم کہ میرا ایمان کس حد تک ایماندار ہے"

(شیش محل صفحہ ۹)

شوکت صاحب چند مختصر جملوں یا لفظوں میں ہی موضوع کی کسی خصوصیت کا اندازہ بڑے دلچسپ طریقے سے کروا دیتے ہیں۔ مثلاً مولوی عبدالحق صاحب کا حال لکھنے سے پہلے ان کا نام یوں لکھا ہے۔

"مولانا انجمن ترقی اردو ڈاکٹر عبدالحق" (صفحہ ۱۷۷)

یا ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مولانا اردو کے بہت بڑے تنقید نگار، اور کتابوں کے سب سے بڑے مقدمہ باز ہیں۔" (صفحہ ۱۷۸)

بعض لوگوں کے متعلق ان کی رائے بہت جامع ہوتی ہے کہ ان کا پورا کردار سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً رشید جہاں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اس اعتقاد نے ان کو ایثار نفس کشی اور بہادری کے کچھ ایسے راز سمجھا دیئے ہیں کہ ہندوستان کی یہ خاتون روس کی سرخ فوج میں مردوں کے دوش بدوش اکڑ کر کھڑی ہو سکتی ہے اور کیا مجال کہ کوئی دیکھ کر یہ پہچان بھی لے کر اس صف میں بہادر سپاہیوں کے علاوہ کوئی اور بھی ہے۔" (صفحہ ۱۲۷)

شیش محل میں شوکت صاحب نے اگرچہ بہت اختصار سے شعرا اور ادبا کے کردار پیش کئے ہیں۔ لیکن یہ نقوش اصلی خدوخال سے بہت قریب ہیں۔

قاضی محمد عبدالغفار نے ایک اور نئے انداز کی سوانح عمری پیش کی ہے یعنی یہ کہ ادیبوں کی تحریروں سے ان کا شخصی اور نفسیاتی تجزیہ پیش کرنا۔ آثار جمال الدین افغانی اور آثار ابوالکلام ایسے ہی نفسیاتی تجزیے اور مطالعے ہیں مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ سوانح عمری اور نفسیاتی تجزیے کی بنا پر لکھی گئی ہے جو قاضی صاحب نے ان کی تحریروں یعنی۔ لسان الصدق۔ الہلال تذکرہ غبار خاطر اور دوسری سیاسی اور ادبی تحریروں سے اخذ کیا ہے قاضی عبدالغفار صاحب عام طرز کی سوانح عمریوں کے برعکس صاحب تذکرہ حسب ونسب اور پھر تعلیم وتربیت کے تدریجی بیان کے قائل نہیں ہیں اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"میں خود تو ایسی سوانح نگاری کا قائل ہی نہیں جس کا احساس

اس کی زندگی صرف ایسے واقعات ہوں کہ کب پیدا ہوئے کس
کے بیٹے تھے کہاں تعلیم پائی۔ کیا کیا کام کئے۔ (صفحہ ۱۱ آثار ابوالکلام
غرض کہ انھوں نے اس مقررہ سانچے سے علیٰحدہ اپنی راہ نکالی ہے
اور ایک ایسا سانچہ تیار کیا جس میں انھوں نے حادث زندگی اور علائق
حیات کے پس منظر میں ایک بڑے انسان کے ذہنی اور معنوی نفسیاتی وجود
کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ اس میں ان کو خاطر
خواہ کامیابی نہیں ہوئی البتہ

"ہندوستانی زبان میں سوانح نگاری کے ایک اسلوب کا
آغاز ضرور ہوتا ہے گو کہ وہ کتنا ہی ناقص اور نامکمل سمجھا جائے"

(صفحہ ۱۲ آثار ابوالکلام)

کتاب کے دو حصے ہیں۔ نقش اول اور نقش ثانی۔ نقش اول مولانا کی
علمی اور سیاسی مشغولیتوں اور رجحانات کو ان کی تحریر اور تقریر کی روشنی
میں پیش کرتا ہے۔ نقش ثانی مولانا کی فطرت مزاج اور شخصیت کی آئینہ
دار ہے۔ اس حصہ میں مصنف نے مولانا کی شخصیت کے ان پہلوؤں کا بخوبی
اندازہ لگایا ہے اور بخوبی ظاہر کر دیا ہے کہ یہ سنجیدہ اور خاموش طبع عالم و
فاضل قید و بند کی سختیاں جھیلنے والا سیاسی رہنما ادیب و شاعر۔ بڑی لطیف
حسیات اور ذوق کا مالک ہے اس کے پاس ایک فنکار کا ذہن و دماغ ہے
"اگر وہ اتنے بڑے انشاء پرداز اور ادیب نہ ہوتے تو بہت
بڑے مصور یا مغنی ہوتے یا شاعر ہوتے" (صفحہ ۱۶ آثار ابوالکلام)

اسی طرح ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"وہ انسان ہیں۔ اور انسان کے تمام کمالات اور اکثر کمزوریوں کو ساتھ لائے ہیں ان کی بے پناہ انفرادیت میں ان کی انسانی کمزوریاں بھی ان کا کمال بن گئی ہیں" (صفحہ ۱۶۸ آثار ابوالکلام)

مولانا ابوالکلام کی سیاسی مصروفیتوں۔ قید و بند اور آزادی کی دھن کے ہنگاموں میں ان کی علمی و ادبی دلچسپیاں تقریباً ختم ہوگئیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

"ادب کا وہ صاحب کمال آرٹسٹ اپنی سیاسی قیادت کی شہرت اور ناموری میں گم ہوگیا" (صفحہ ۲۰، آثار ابوالکلام)

لیکن غبار خاطر کی اشاعت نے اس خیال کو غلط ثابت کیا اور اس کے مطالعہ کے بعد یہ ظاہر ہوگیا۔ کہ

"جس ساز کے تاروں کو میں۔ نے سمجھا تھا کہ ٹوٹ گئے ہوں گے ان کی آہنگ کو تو میں نے کچھ اور زیادہ دل نواز پایا ان کے اندر زندگی اس طرح بولتی ہوئی پائی اور وجدان لطیف اسی طرح کارفرما پایا جس طرح کہ ۲۵ سال پہلے وہ قلم کو نغمہ اور کاغذ کو رنگ عطا کرتا تھا۔"

(صفحہ ۲۰، آثار ابوالکلام)

غرض یہ کہ قاضی محمد عبدالغفار صاحب نے اس مختصر سے نفسیاتی مطالعہ میں اور غبار خاطر کی سطور میں مولانا کی فطرت کے چند پہلوؤں

کو جھانکتا ہوا دیکھا ہے۔ چڑے چڑیا سے ان کی دلچسپی ڈاکٹر محمود صاحب کی چیونٹیوں اور چڑیوں کی دعوت کرنا اور پھر کوؤں کی نفسیات کا مطالعہ۔ یا پھر اپنی بیوی کی وفات پر پیمانہ صبر کا لبریز ہو جانا اور مولانا کا بڑی کوشش اور کاوش سے اس کو چھلکنے سے باز رکھنا۔ غرض ان تحریروں سے انھوں نے مولانا کی نفسیات کا دلچسپ مطالعہ کیا ہے۔ اگرچہ اس کو مکمل اور اعلیٰ پیمانہ کا نفسیاتی مطالعہ نہیں کہا جا سکتا۔ نقش اول تو ان سیاسی حالات اور واقعات پر مشتمل ہے جن سے قاضی صاحب کے ہیرو کا مخالف یا موافق کی حیثیت سے واسطہ کسی نہ کسی طور پر رہا ہے۔ چنانچہ یہ تقریباً نصف صدی کے ان سیاسی حالات اور واقعات کی مختصر سی تاریخ ہے جو ہندوستان میں وقتاً فوقتاً رونما ہوتے رہے۔ نقش ثانی میں مصنف نے ہیرو کے شخصی اور نجی پہلوؤں کو نفسیاتی طور پر پیش کرنے کا وعدہ فرمایا تھا مگر وہ اس کو خاطر خواہ طور پر پورا نہ کر سکے انھوں نے مولانا آزاد کی فطرت انہی چار پہلوؤں کو غبار خاطر یا تذکرے یا ان کے خطبات کی روشنی میں نمایاں کیا ہے جن سے ایک عام ذہن رکھنے والا قاری بھی انہی تحریروں کی روشنی میں بخوبی واقف ہو جاتا ہے مثلاً مولانا کی خلوت پسندی رکھ رکھاؤ انانیت۔ علم و فضل کا احساس اور ذوق جمال اور یہ وہ پہلو ہیں جو محض غبار خاطر ہی کے مطالعہ سے ہم پر آشکار ہو جاتے ہیں۔

قاضی صاحب نے اپنی سوانح نگاری کے لئے مقررہ اور معینہ

سانحہ ناپسند کر کے ایک وسیع تر پیمانہ تلاش کیا تھا۔ مگر بعض اسباب کی بنا پر یہاں کی اس سوانح عمری کا ظرف بہت چھوٹا نظر آتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے موضوع سے محبت اور عقیدت کی شدت کی بنا پر ان کو اپنا نقطۂ نظر زیادہ اہم نظر آتا ہے اور اس تصویر کی تزئین و آرائش کے وقت خود اپنی پسند کو زیادہ ملحوظ رکھا ہے۔ اس امر کا احساس اس مقام پر خصوصیت سے ہوتا ہے جب وہ غبار خاطر کا حوالہ دے کر "چڑے چڑیا کی کہانی" کے متعلق اظہار خیال کرتے کرتے وہ علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کا موازنہ کرنے لگتے ہیں۔

"اقبال نے بھی فلسفہ خودی ایک رمز ہستی کی حیثیت سے پیش کیا ہے مگر مولانا اور اقبال کے درمیان فکر و نظر کا ایک فرق بیّن ہے اقبال رمز خودی کا فلسفہ صرف مسلمان کے لئے پیش کرتے ہیں۔ اسی کو اپنا مخاطب بناتے ہیں اور اسی کو زندگی کا پیغام دیتے ہیں۔ مگر مولانا کا فلسفہ حیات اقبال سے زیادہ وسیع زیادہ ہمہ گیر ہے۔"

(آثار ابوالکلام صفحہ ۲۵)

نامی صاحب نے اقبال کے پیام کے مخاطب کے لئے لفظ مسلمانوں کے بجائے محض "مسلمان" اور انھیں کے بجائے اسی کا لفظ استعمال کر کے ایک زبردست نفسیاتی حربہ سے کام لیا ہے اور یوں اقبال کے پیام کی تنگی اور محدودیت کی شدت کا احساس

دلا کر فارسی کو اپنا ہم نوا بنانا چاہا ہے۔ مگر انھوں نے اس پر اکتفا نہیں کی اور کھلم کھلا ان کو فرقہ پرست اور تنگ نظر بنا دیا ہے۔

"مگر اب جبکہ ۴ کروڑ مسلمان خود اپنے ہی لیڈروں کی خود غرضی کا شکار ہو گئے تو یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ اقبال کے پیام کی روح انسانیت کی وسیع ترپھیلاؤ میں نہ پھیل سکی اور اسی لئے اقبال کا پیام فرقہ پرستوں کے لئے فرقہ پرستی کا ایک فتنہ انگیز کھلونا بن گیا۔"

(آثار ابوالکلام صفحہ ۲۵۳)

ممکن ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ کہنا صحیح ہو کہ۔

"خود شناسی اور خودی کا وہ فطری عمل جس کو مولانا نے ایک چڑیا کے بچے کے پروں میں کارفرما دیکھا۔ انسان کے بگڑیں اور کبھی زیادہ نسل اور فرقہ اور مذہب کی تنگ نظری سے آزاد ہے۔"

(صفحہ ۲۵۳)

لیکن خوش قسمتی صاحب نے علامہ اقبال کے بارے میں اس قسم کی خیال آرائی کر کے اپنے فن کو صدمہ پہنچایا ہے یہ بھول گئے کہ وہ کوئی سیاسی مبصر یا پراگندہ کرنے والے نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے سوانح نگار جو اپنے موضوع کو نفسیاتی اعتبار سے دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہو۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے ایک ایسے شاعر کے

پیغام کو تنگی اور محدودیت کا ہی نہیں بلکہ فرقہ پرستی اور فتنہ انگیزی کا الزام دیا ہے جس کو صرف لاسم کر وٹ گم کردہ راہ مسلمان ہی نہیں تمام مشرق خصوصاً عالم اسلام (جو اتفاق سے انسانیت کے ایک بڑے حصہ پر مشتمل ہے) اور مغرب کے اہل نظر "شکوہ کرنے والے" شاعر کی حیثیت سے نہیں جانتے بلکہ اس شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں جو خدا کے مقابل انسان کی طرف سے وکالت اور جرح کرتے ہوئے دعویٰ کرتا ہے۔

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم　　من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اور اس طرح ان کی سوانح نگاری کا یہ طرف افسوسناک نظر آنے لگا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ خود ان کا صاحب نظر اور نکتہ سنج ہیرو بھی اپنے سوانح نگار کے اس محاکمہ کو اچھی نظر سے نہ دیکھتا ہو جس نے ان کو اقبال سے برتر و بہتر ثابت کیا ہے۔

آخر میں سیدھے سادھے الفاظ میں بیان کی ہوئی ایک سیدھی سادھی معصوم اور مخلص شفیق اور حلیم زندگی کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جس نے اپنی زندگی میں اہم اور زبردست کام بھی ایسی خاموشی اور آہستگی سے انجام دیئے گویا بڑی ہی معمولی بات ہو۔ مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھا یا اردو سوانح نگاری کی بنا ڈالی اپنی غزل گوئی کو یکسر قومی شاعری سے مبدل کر دیا یا مسدس لکھی چپ کی داد لکھی یا مناجات بیوہ ان سب کی اہمیت سے وہ بھی واقف تھے اور دوسرے بھی واقف ہیں۔ لیکن ان کے

طریق کار میں ایک خاص دھیما پن آہستگی اور نرمی ہوتی تھی
چنانچہ یادگار حالی بھی اسی طرز سے لکھی جانا چاہئے تھی۔ حالی نے بڑے
بڑے کام انجام دیئے اور نیچی نگاہوں سے قوم کے حضور پیش کر دیئے
ایسے شخص کی سوانح عمری میں زور شور یا بلند بانگ دعوے کرنا نا
انصافی تھی۔

یادگار حالی کے متعلق اکثر و بیشتر لکھا جاتا ہے لیکن ابھی تک ان
کے حالات اس انداز سے سامنے نہ آئے تھے کہ ان کی شخصیت کے تمام
پہلو جھلکتے نظر آئیں۔ اہل قلم اس ضرورت کو عرصہ سے نظر انداز کرتے چلے
آرہے تھے چنانچہ اس فرض کو اس قلم نے پورا کیا جس کے طبقہ سے
حالی کو خاص انسیت اور ہمدردی تھی۔ صالحہ عابد حسین نے ماؤں بہنوں
اور بیٹیوں کے محسن کے سوانح اور حالات لکھ کر ان کے سر سے ایک بڑی
ذمہ داری ہٹا دی اور ان کے احسانات کا بدلہ تو کیا چکایا البتہ اس
طبقہ کی طرف سے ایک ہدیہ عقیدت پیش کر دیا۔

اگرچہ صالحہ عابد حسین۔ مولانا حالی سے خاندانی قرابت رکھتی
ہے لیکن انھوں نے یادگار حالی کو اس نظریہ سے نہیں لکھا ہے۔
بلکہ ان کی ادبی خدمات کی بنا پر یہ تذکرہ لکھا ہے۔

"میری عقیدت ان کے ساتھ خاندانی رشتہ کی بنا پر نہیں
بلکہ اس عظیم الشان خدمت کی وجہ سے ہے جو انھوں
نے اردو ادب شاعری اور اردو زبان کی انجام دی ہے"

(صفحہ ۸ دیباچہ یادگار حالی)

اس کے علاوہ حالی کی سیرت نے بھی ان کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے وہ لکھتی ہیں۔

"دوسرا سبب میری عقیدت کا حالی کی لاثانی سیرت ہے حالی انسان کی حیثیت سے ایک ولی صفت شخص تھے اور اس بارے میں مجھے اپنے بزرگوں اور مولانا کے دوستوں اور نیاز مندوں وغیرہ سے جو باتیں معلوم ہوئیں ان کی بنا پر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ ان کی ذات میں ان قدروں کا جلوہ نظر آتا ہے جن پر انسانی فضیلت کا انحصار ہے۔" (یادگار حالی صفحہ ۸)

یادگار حالی میں ایک خاص نرمی اور لطافت کے ساتھ محبت کا ایک سچا اور بے لوث جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس کے تین حصے ہیں (۱) نشو ونما (۲) آب و رنگ (۳) برگ و بار نشو ونما میں پیدائش سے لے کر شادی اور شاعری کے آغاز تک کا ذکر ہے۔ آب و رنگ میں جوانی کے حالات اور اس میں وقتاً فوقتاً رد و بدل کو پیش کیا ہے۔ برگ و بار میں مولانا حالی کو بحیثیت شاعر، نثر نگار، نقاد پیش کیا ہے ان کے کاموں پر تنقید کی ہے۔

برگ و بار اس کتاب کا دلکش ترین حصہ ہے اس میں مولانا حالی کی سیرت اور کردار سے واقفیت ہوتی ہے وہ اپنے گھر میں اپنے خاندان

اوصاف بچوں میں ہنستے بولتے اور چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں کبھی
وہ اپنے معصوم نواسے سجّادین کی ہر آواز پر نیچے اترتے اور اس کو جواب
دیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی عید کی رات کو لڑکیوں کی
ہیں شریک ہوتے ہوئے ملتے ہیں کبھی اپنے متعلقین ہمسایوں اور
ملازمین کے ہر معاملہ میں دلچسپی لیتے ہوتے ہیں۔ غرض سفر یا حضر خود کہیں
مہمان ہو گئے ہوئے ہوں یا ان کے یہاں کوئی آیا ہوا ہو۔ ایک معمولی
اور نجی خط لکھ رہے ہوں یا کوئی تصنیف کر رہے ہوں حالی کی
خاموش سنجیدہ اور نیک سرشت ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ سب سے بڑی
خوبی یہ ہے کہ طرز بیان اور لہجہ اپنے موضوع کے شایان شان ہے بڑا
دلکش اور دل نواز ٹھہرا ہوا اور دھیما۔ اس کو پڑھ کر قاری کسی الجھن کسی دقت
اور پیچیدگی کا شکار نہیں ہوتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے چاند کی
نرم نرم کرنیں کسی گھنے درخت کے پتوں میں سے چھن چھن کر آ رہی ہیں۔

اس کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حالی کے رہن سہن اور
معاشرت کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ عام طور پر ہماری قدیم معاشرت
کے عیوب ہی پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس معاشرت اور زندگی
کے چند دلکش پہلو اس میں نمایاں ہو جاتے ہیں اور خصوصیات جو
اس زمانے میں عام تھیں اب بمشکل ڈھونڈے ہی سے ملتی ہیں۔
پرانے لوگوں کا وہ خلوص ان کی وہ وضعداری اور با اصول زندگی
ان کی محبت اور توجہ اپنی ذات اور خاندان سے بڑھ کر تمام خاندان

اور محلے والوں نوکروں اور ہر آشنا کے لئے وقف ہوتی تھی وہ دوسروں کے دکھ سکھ کو اپنا ہی سمجھتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

مولانا حالی نے ایک بار کسی انگریز مصنف کے حوالے سے لکھا تھا کہ بیوگرافی سمندر کی موجوں کی طرح چلا چلا کر ان سے کہتی ہے کہ جاؤ تم بھی ایسے ہی کام کرو خود ان کی یہ سوانح عمری چاہے قاری کو ان کے جیسے کام کرنے پر اکساتی ہو یا نہ اکساتی ہو لیکن اس کے مطالعے کے بعد قاری ان کی شخصیت کے تمام تر دلکش و دلنواز پہلوؤں کو خود اپنی شخصیت میں پانے کا آرزو مند ضرور ہو جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض لوگ اس میں تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھنا چاہتے ہوں اور دوسرے بہت سی معلومات جو اس میں شامل نہیں ہیں کرنا چاہتے ہوں۔ اور اس لحاظ سے بقول مولانا ابوالکلام آزاد

"بلاشبہ یہ خواجہ صاحب کی مطلوبہ سوانح عمری نہیں ہے لیکن مطلوبہ سوانح عمری کا ایک ایسا قیمتی مواد جس سے زیادہ مستند مواد ہمیں نہیں مل سکتا"

(صفحہ ۱ پیش لفظ از مولانا ابوالکلام آزاد)

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ صالحہ عابد حسین نے اردو میں ایک مستند دلکش اور اہم سوانح عمری کا اضافہ کیا ہے۔

حالی و شبلی کے بعد یعنی بیسویں صدی کی سوانح نگاری کے پیش نظر جائزے کو کسی طرح بھی مکمل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو بے شمار سوانح

نگاروں اور خاکہ نویسوں میں سے چند ممتاز اور نمایاں مصنفین کی تصنیفات کا سرسری جائزہ ہے۔ ورنہ ہماری کم سن زبان نے دوسرے اصنافِ ادب کی طرح بلکہ چند ایک اصناف سے بہت زیادہ اس صنعتِ ادب کا اچھا خاصہ سرمایہ جمع کر لیا ہے۔ ہماری سوانح نگاری میں برابر نئے نئے اضافے ہو رہے ہیں اور نئے تجربے کئے جا رہے ہیں۔ جدید طرز کا بہترین تجربہ با اضافہ اردو کی مایۂ ناز ادیبہ عصمت چغتائی نے اپنے مرحوم بھائی عظیم بیگ چغتائی کی یاد میں "دوزخی" لکھ کر کیا ہے۔ یہ اپنے طرز کا بالکل نیا اور اچھوتا خراج محبت ہے جو ایک بہن نے اپنے بھائی کو دیا ہے اور مجسم قہقہہ عظیم بیگ چغتائی کے قارئین پر عجیب و غریب انکشاف کیا ہے کہ یہ دنیوں کو ہنسانے والا مصنف کیسی تلخ حقیقتوں کا شکار رہا تھا اور اس کی زندگی مجسم آہ تھی۔

بہر حال اردو سوانح نگاری نے ایک صدی کے عرصہ میں خاصی ترقی کر لی ہے۔ اور اگرچہ اس کا موجودہ سرمایہ قابلِ اطمینان نہیں لیکن امید افزا ضرور ہے ہمارے مصنفین میں سے بیشتر بڑی اچھی صلاحیتوں کے مالک ہیں اور ان میں سے اکثر بڑی تلاش محنت اور خلوص سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے اس کے مستقبل سے ناامید ہونے کی وجہ نظر نہیں آتی۔

ساتواں باب

آپ بیتیاں

آپ بیتی یا خود نوشت سوانح عمری بھی فن سوانح نگاری سے ہی متعلق ہے اگرچہ مکاتیب اور سفرنامہ بھی کسی شخص کے ذاتی حالات کا حصہ بن سکتے ہیں مگر نصب العین کے اعتبار سے یہ دونوں اصناف سوانح میں داخل نہیں اور ان کو براہ راست سوانح عمری میں شمار کرنا مناسب نہیں۔ البتہ ان کی مدد سے اچھی اور جامع سوانح عمریاں تیار کی جاسکتی ہیں۔ مکاتیب کی مدد سے ہم صاحب سوانح کی زندگی اور اعمال کے بعض ان پہلوؤں سے واقف ہو جاتے ہیں جو کہیں اور یا کسی اور ذریعہ سے ملنا ناممکن ہوتے ہیں۔ ان سے نفسیاتی مطالعہ میں بڑی مدد ملتی ہے۔ سفرنامے اس معاملہ میں اتنی زیادہ مدد نہیں دیتے یہ صاحب سوانح کے اپنے نئے نئے تجربات اور معلومات کا مجموعہ

ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے مطالعہ سے مصنف کے اپنے رجحانات ذوق، پسند اور زاویہ نگاہ سے واقفیت ہوتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کون سے مناظر اور مقامات اس کے ذوقِ نظر اور احساس جمال کو تسکین دیتے ہیں وہ بیرونی مقامات اور اجنبی تہذیب و تمدن کو کن اقدار اور معیاروں پر پرکھتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ ڈائریاں یا روزنامچے اگرچہ بظاہر خود نوشت سوانح عمری سے قریب تر ہوتے ہیں لیکن ان کے مطالعہ سے لکھنے والے کے مزاج اور فطرت کا مکمل جائزہ نہیں لیا جا سکتا ہے دراصل خود نوشت سوانح عمری کے بکھرے ہوئے اور الگ الگ ٹکڑے ہوتے ہیں جن میں واقعات کم اور تاثرات زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کو مکمل سوانح کا قائم مقام سمجھنا سخت غلطی ہے۔ عام طور پر ڈائری لکھنے والے کچھ محتاط ہو کر لکھتے ہیں اور بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو بے کم و کاست اپنے تاثرات کو صفحۂ قرطاس کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ اس میں جتنا لکھا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ چھپایا بھی جا سکتا ہے۔ اردو میں مکاتیب کا رواج کثرت سے ہو گیا ہے اور تقریباً تمام مشاہیر کے خطوط و مکاتیب شائع ہو چکے ہیں۔ اور جن میں سے بعض اردو کے بیش بہا ادبی سرمائے شمار کیے جاتے ہیں۔ اردو کے عظیم مکتوب نگار مرزا غالب کے خطوط کے علاوہ مولانا شبلی نعمانی مولانا ابوالکلام آزاد (غبار خاطر) مولانا محمد علی اور دیگر ادبی اور سیاسی مشاہیر کے خطوط کو اردو ادب میں ایک بلند مقام حاصل ہے خطوط

اور مکاتیب کا موضوع ایک مستقل اور جداگانہ موضوع ہے اور یہاں پر اس کا ذکر مناسب نہیں نظر آتا۔

سفرناموں کی اگرچہ خاصی تعداد ہے۔ مگر اس کو تسلی بخش نہیں کہا جاسکتا ہمارے اہل قلم اور اہل وطن حضرات میں مہماتی (Enterprise) جذبہ اور اولوالعزمی تقریباً ناپید ہے ان کو دور دراز یا اجنبی مقامات سے بہت کم دلچسپی ہوتی ہے۔ تمدن کے نئے نئے مظاہرے اور نئی نئی تہذیبیں ان کے لئے قابل اعتنا نہیں ہوتیں یہاں تک کہ خود اپنے بھی وطن کے قابل دید مقامات ایلورا کے غاروں یا ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں نا سگا پربت۔ کنچن جنگا کی چوٹیوں میں بھی ان کے لئے کوئی دلکشی نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ جو لوگ غیر ممالک میں بھی جاتے ہیں ان کا نقطۂ نظر کسی حد تک کاروباری ہوتا ہے جہاں کہیں بھی جاتے ہیں اپنے گرد و پیش سے بیگانہ ہو کر اپنے کام سے کام رکھ کر واپس آجاتے ہیں۔ ان سے سفرناموں کی توقع ہی عبث ہے اور کوئی سفرنامہ لکھتا بھی ہے تو حقیقی سفرنامے تک پہنچتا ہی نہیں۔ مستقل روزنامچے لکھنے کی عادت بھی ہمارے یہاں کم ہی پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں خواجہ حسن نظامی کا نام یہاں نظر آتا ہے ان کا روزنامچہ سالہا سال تک بڑی پابندی سے شائع ہوتا رہا ہے۔ اگرچہ اس میں شخصی اور خانگی عنصر غالب ہوتا ہے۔ لیکن حالات حاضرہ پر بڑے اچھے اور دلچسپ تبصرے بھی ملتے ہیں۔ خواجہ صاحب موصوف بقول شخصے نئے فیشن کے مولوی بلکہ پیر رہے لیکن

مذہبی مصروفیات اور پیری مریدی کے مشاغل کے علاوہ وہ اپنے وقت اور زمانے کی سیاست اور تغیرات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور ان پر بڑی جدت اور تکلف سے خیال آرائی کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے علاوہ کوئی ایسا مستقل روزنامچہ لکھنے والا شخص بظاہر نظر ہی نہیں آتا اب صرف خود نوشت سوانح عمریوں کا سوال رہ جاتا ہے۔ اس طرف بھی ہمارے اہل قلم حضرات نے بہت کم توجہ دی ہے اوّل تو یہ کہ ہمارے یہاں اپنی زندگی کو کچھ وقعت ہی نہیں دی جاتی۔ زندگی ہم تک ایک ناخواندہ مہمان کی طرح آتی ہے اور اسی طرح واپس چلی جاتی ہے۔ نہ ہم اس کی خاطر مدارات کرتے ہیں اور نہ جاتے وقت اس کے لئے زادِ راہ مہیا کرتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ہم دوسروں کے عیب و ثواب کو متجسسانہ دیکھتے رہتے ہیں اور دوسروں کی زندگی کی تفصیلات و جزئیات کو زیادہ سے زیادہ پیش کرکے محظوظ ہوتے ہیں۔ لیکن خود اپنی زندگی کے ادنیٰ سے ادنیٰ تغیر اور خفیف سے خفیف پیچ وخم سے ناواقف رہتے ہیں۔ ہم اس کی نیرنگی اور تنوع کو اپنے ساتھ ہی لے جاتے ہیں اور سکھ کے ان لمحات سے خیالات اور جذبات کے ان طوفانوں سے جن سے ہم اندر ہی اندر دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے قریب ترین عزیز اور دوست بھی ناآشنا اور بے خبر ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ اسی لئے ہوتا ہے کہ ہم خود اپنی حقیقت سے ناآشنا اور اپنی ہستی سے غافل رہتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ حقیقت نگاری بڑا مشکل کام ہے۔ بالخصوص

جب انسان اپنی کہانی خود لکھنے بیٹھے۔۔ یہ سچائی صاف گوئی۔ دیانت داری اور جرأت اظہار کا زبردست امتحان ہے۔ ایک اچھے آپ بیتی لکھنے والے سے اس امر کی توقع کی جاتی ہے کہ اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان اعمال اور افعال کا جو اس سے سرزد ہو چکے ہیں اس کی ذات سے صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ اس کے نام سے منسوب ہیں ورنہ اب وہ دوسروں کی امانت ہیں دوسرے ان سے خواہ سبق لیں یا لطف جیسا کہ پہلے باب میں ذکر آچکا ہے کہ ایک مخلص اور فنی نقطۂ نظر رکھنے والے کے لئے لازم ہے کہ وہ Jhon Dunton کی طرح بلا خوف وخطر اپنا نامۂ اعمال یہ کہہ کر پیش کردے۔

"My very soul may naked here be seen, both what I was and what I should have been. Dissected thus, I stand a living martyr grown, come read my errors and reform your own.

آپ بیتی اسی وقت دلکش اور حسین ہوتی ہے جب انسان سچائی اور دیانت داری سے پیش کرتے ورنہ سادہ اور سپاٹ زندگی کو تصنع کا خول چڑھا کر پیش کرنا تو فضول ہی ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں ایک آپ بیتی ذکر میر کی صورت میں ملتی ہے

اگرچہ میر صاحب نے یہ آپ بیتی فارسی زبان میں لکھی ہے۔ لیکن فارسی زبان میں ہونے کی وجہ سے اس کا شمار اردو کی آپ بیتیوں میں نہیں کیا جا سکتا چونکہ میر صاحب ہی پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کو قابل اعتنا سمجھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنی ہمہ حسرت اور سراپا غم بربادی کی تعبیر زندگی بہت ہی عزیز تھی۔ جس کے اوراق پریشاں کو انھوں نے تمام حسرتوں اور ناکامیوں کے باوجود ذکر میر میں محفوظ کر لیا ہے اور میر صاحب کی یہ خود نوشت سوانح عمری اس لئے بھی اہم ہے کہ اسی کے سہارے ہم میر صاحب کی شخصیت کا اندازہ لگاتے ہیں اور ان کے رنگ طبیعت اور افتاد مزاج کو انھی حالات کی روشنی میں جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ میر صاحب کی اس فارسی زبان کی آپ بیتی کے علاوہ کوئی دوسری آپ بیتی نہیں ملتی جس کا ذکر کیا جا سکے۔ چنانچہ اس صنف ادب میں اردو تہی دامن نظر آتی ہے۔

سرسید رضا علی کا اعمال نامہ اردو کی پہلی مستقل اور قابل ذکر آپ بیتی ہے۔ سید رضا علی نے اپنی یہ آپ بیتی بڑی محنت اور کاوش سے لکھی ہے۔ یہ نہ صرف اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ ایک بڑے آدمی کی داستان حیات ہے جو خود اس کے قلم سے نکلتی ہے۔ بلکہ اس سے ہم گزشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ کے سیاسی تغیرات انقلابات خصوصاً مسلمانوں کی من حیث القوم سیاست سے مطلع ہو جاتے ہیں۔ یہ نہ صرف مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کی آئینہ دار

ہے بلکہ اس میں قصباتی شرفا کی زندگی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہے مختلف وزنا نے اور مرد انے کردار صاحب سوانح کے حالات کے ضمن میں ابھرتے ہیں اور اپنے نقش دلوں پر چھوڑ جاتے ہیں۔ مصنف نے بڑی کوشش کی ہے کہ اپنے خود نوشت سوانح عمری میں مشرق و مغرب کے تصورات کا متعدل امتزاج و آہنگ پیدا کر سکیں چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> میرے گلدستہ میں دونوں قسم کے پھول ملیں گے میں نے حقیقت نگاری کو ملحوظ رکھا ہے۔ مغربی ممالک میں سوانح حیات لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ بیتی کے ساتھ ساتھ جگ بیتی بھی بیان کی جاتی ہے۔ دنیا میں واقعات کا سلسلہ ایسا مربوط ہوتا ہے کہ اپنی کہانی اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے۔ جب دوسروں کے حالات بھی درج کر دیئے جائیں۔ (دیباچہ اعمالنامہ)

اور اس جگ بیتی کو انھوں نے اس درجہ ملحوظ رکھا ہے کہ خود ان کی آپ بیتی پس پشت رہ جاتی ہے اور بعض دفعہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھتے لکھتے اچانک مصنف کو خیال آگیا ہے کہ در اصل اس کو اپنے بارے میں لکھنا تھا۔ بہر حال ان کے اس طریق کار نے ان کی سرگذشت کو مسلمانان ہند کی دلچسپ اور جامع سیاسی تاریخ بنا دیا ہے جس میں علی گڑھ کی اس سیاست اور کشمکش کا ذکر ہے

مفصل .... ملتا ہے جو اس زمانے میں یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کے درمیان جاری تھی۔ اس کے علاوہ اعمالنامہ میں ہم کو پچاس برس پہلے کے علی گڑھ کے اس مخصوص اور دلچسپ ماحول کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ جس کی یاد وہاں کے اولڈ بوائز کو ہمیشہ مضطرب اور بے چین رکھتی ہے۔ ساتھ ہی علی گڑھ کے ہم جماعت ساتھیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ حصہ تھا جہاں مصنف اپنے قلم کی تمامتر روانی اور دل کا انتہائی جذبہ صرف کر سکتا تھا۔ اپنے دوستوں کا ذکر اور وہ بھی کون سے ؟ طالب علمی کے زمانے کے ساتھی۔ یہ زمانہ انسان کی زندگی کا عہد زریں ہوتا ہے۔ وہ وقت جب انسان مادرِ درسگاہ کی آغوش میں دنیا کے تلخ و ترش سرد و گرم سے بیگانہ ہو کر زبان حال سے کہتا ہوتا ہے۔ ع۔

خندہ زن ہیں بے تکلف فکر سے آزاد ہیں

پھر اس کا ذکر کیوں نہ اس انداز سے کیا جائے کہ پڑھنے والا یوں محسوس کرنے لگے کہ مصنف پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں جا پہنچا ہے لیکن اس دلچسپ مقام سے سر سید رضا علی سربلند کئے ہوئے بڑے بے رخی اور بے نیازی سے گزر گئے۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور علی گڑھ کی زندگی کے بارے میں خود اپنا ذکر کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ اس میں بوئے انانیت آنے لگی ہے۔ انھوں نے ایک جگہ دیباچہ میں ذکر کیا ہے کہ

"میں نے یہ تہیہ کر کے قلم اٹھایا تھا کہ واقعات کو اصلی صورت میں پیش کروں کا موجودہ فن تجدید شباب Rejuvenation کے ماہروں کی طرح یہ ہرگز جائز نہ رکھوں کہ آنکھیں ماتھے پر پہنچ جائیں۔ نیچے کا ہونٹ ٹھوڑی پر پڑا ہو یا دونوں کان گلے کا ہار ہو جائیں۔ حقیقت نگاری بڑا مشکل کام ہے۔ بالخصوص جب انسان اپنی کہانی خود لکھنے بیٹھے میری تمام تر یہ کوشش رہی ہے کہ انصاف سے کام لوں کسی تصویر کا رنگ پھیکا نہ پڑے نہ زیادہ گہرا ہونے پائے"

(دیباچہ اعمالنامہ)

لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہ رنگ کچھ پھیکا نظر آتا ہے۔ سر سید رضا علی نے ایک متوسط الحال طالب علم کی حیثیت سے زندگی شروع کی اور عروج و کمال کی انتہائی کامرانیوں تک پہنچے اور ان کے حصول سے ان کو یقیناً مسرت بھی حاصل ہوئی ہوگی۔ لیکن وہ اس مسرت و فخر میں قاری کو شریک نہیں کرتے۔ زندگی نے انھیں جو کچھ دیا وہ انھوں نے بہت ناز اور تمکنت سے قبول کر لیا کوئی اظہار مسرت نہیں کسی قسم کا جذبہ یا تاثر نہیں۔

اعمالنامہ کو انھوں نے تیرہ ابواب پر تقسیم کیا ہے جس میں اپنے بچپن کے حالات۔ خاندانی حالات مکتب اور اسکول پھر کالج کا زمانہ بیان کیا

ہے اس کے علاوہ مختلف سیاسی واقعات کا ذکر اپنے عقاید ومذہب شعروشاعری اور ادب کے متعلق اپنے خیالات اور نظریات کا اظہار بھی کیا ہے۔ گیارھواں باب ایک خاص اہمیت اور خصوصیت رکھتا ہے اس کے بیان کے لئے انھوں نے بڑے بلند بانگ دعوے کئے ہیں یہ بات ان کے بقول ان کی روداد محبت ہے اور اس کا عنوان ہی "حسن ومحبت" رکھا ہے۔ اس باب ہی کے لئے شاید انھوں نے دیباچہ میں حقیقت نگاری کا وعدہ کیا تھا۔ اور شروع ہی سے قاری کو دھمکیاں دی تھیں کہ واقعات کو خواہ کسی نوعیت کے ہوں گے۔ اصلی خدوخال میں پیش کریں گے۔ چنانچہ اس باب کو شروع کرتے ہی قاری سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن اس باب کو شروع کرتے وقت سر سید رضا علی کا قلم کیسا شرمایا ہے۔ اس کا لطف کچھ پڑھنے والا ہی اٹھا سکتا ہے۔ کہ انھوں نے کس کس طرح سنبھل سنبھل کر حرف مطلب نوک قلم تک لانے کے لئے خود کو کس کس طرح آمادہ کیا ہے ان کی یہ لمبی چوڑی پیش بندیاں اور تمہید یں قاری کو مشتاق سے مشتاق تر بناتی چلی جاتی ہیں۔ آخر ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم کہہ کر بات اس طرح شروع کرتے ہیں گویا خدا جانے کون سی رنگین داستان بیان کر رہے ہیں اور کون سا دفتر معصیت کھول رہے ہیں۔

"اس باب کو گلستان کا باب پنجم سمجھنا چاہیے۔ میں عرصہ تک سوچتا رہا کہ دل کے معاملہ کا اعمالنامہ میں ذکر کروں یا

نہ کروں۔" (صفحہ ۱۳۰ اعمالنامہ)

اس تمہید کے بعد بھی ان کا قلم کسی طرح اس راہ پر چلنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا تو اس کو دھوکے سے اس طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ لہذا پہلے محبت کے فطری جذبہ پر بحث شروع کر دیتے ہیں۔ ماں باپ اولاد۔ بھائی بہن۔ محبوب اور محب کی محبت کا فلسفہ بیان کرتے کرتے ایران کے غیر فطری محبوب، ہندی کی الٹی گنگا، اور ہندی گیتوں میں برہمن کا سہارا لیتے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور بات ٹلتی جاتی ہے کہ یکایک ان کو احساس ہوتا ہے کہ وہ بات میں بات بڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن اس طرح قاری کو بہلایا تو نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اب وہ اس کو ایک کھلونا دے کر بہلانا چاہتے ہیں۔ اردو میں آپ بیتی کا قصہ نکال بیٹھتے ہیں۔

"اردو میں آپ بیتی لکھنے کا رواج نہیں ہے جو انگریزی داں حضرات سیاسی چسکے کے باعث اپنے حالات لکھتے ہیں وہ انگریزی میں خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ اور جن نامور انگریزوں نے اپنے حالات خود اپنے قلم سے لکھے ہیں ان کے لئے بہترین نمونہ سمجھتے ہیں۔ پہلے میرا بھی قصد تھا کہ یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھوں۔"

(اعمالنامہ صفحہ ۳۹)

لیکن ان کی تحریر سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا قلم سخت گھبرایا

ہوا ہے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت مول لے لی۔ ایک طرف تو فن کا تقاضا کہ جو کچھ حقیقت ہے اس کو بیان کر جاؤ اور دوسری طرف شرم ہے کہ آگے چلنے نہیں دیتی۔ مگر بات ٹالے نہیں ٹلتی۔ چار و ناچار بڑی نیچی نظر سے اپنے متعلق کچھ لکھنے پر آمادہ ہوتے ہی ہیں کہ خیال آتا ہے لاؤ اپنی خطا کے جواز کے لئے کسی بڑے ہی ثقہ انسان کو اپنی ہی کشتی میں سوار کر لیں اور اس کی آڑ میں بڑھیں چنانچہ ملا عبدالقادر بدایونی کی آڑ میں چلنا شروع کرتے ہیں۔

"ملا عبدالقادر بدایونی کی جرأت کی داد دینی چاہیئے کہ ان کے تقدس نے اس آفت جان کے حالات قلم بند کرنے سے باز نہ رکھا جس سے انھوں نے دل لگایا تھا مگر اس زمانے میں چھاپے کا فن ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اور ملا ئے موصوف کو اطمینان تھا کہ ان کی کتاب ہر کس ناکس کے ہاتھ میں نہ پہنچے گی اب یہ حالت ہے کہ منہ سے بات نکلی اور پرائی ہوئی اور سچ تو یہ ہے کہ کسی کو الزام دینے کا مجھے حق نہیں ہے میں تو خود یہ کتاب اس لئے لکھ رہا ہوں کہ لوگ پڑھیں اور میری بابت جو رائے چاہے قائم کریں"

(اعمالنامہ صفحہ ۳۹۴)

غنیمت ہے کہ ان کے خیال کو راستے ہی میں ملا عبدالقادر بدایونی مل گئے ورنہ نہ جانے کس کس کو سند کے لئے پکڑ لاتے اور در

اصل بات فقط اتنی تھی کہ

"جنوبی افریقہ دوسری مرتبہ میں ۱۹۳۵ء کے شروع میں گیا تھا تین سال وہاں رہا وہاں پہنچے دو مہینے گذرے تھے کہ مس یو نو ویلو سامی کا لبعد کو لیڈی رضا علی ہوئیں ،کمبرلی میں مہمان ہوا اور میں نے شادی کا تہیہ کر لیا۔

(صفحہ ۱۳۹۵ اعمالنامہ)

غرض یہ کہ اس مختصر سی بات بتانے کے لئے کہ ان کو افریقہ میں اپنی میزبان پسند آگئی تھیں اور انھوں نے بھی ان کو پسند کر لیا تھا۔ اور نتیجۃً شادی بھی ہوگئی۔ ایسی لمبی چوڑی تمہید اٹھا کر قاری کو بے وجہ الجھن میں ڈالا۔ اور پھر اس کا ذکر کر کے اس قدر پچھتائے ہیں کہ کوئی اقبال جرم کیا ہے۔ اپنی خفت کو مٹانے کے لئے انھوں نے شملہ کے یادگار مشاعرے کے عنوان کے تحت میں "حسن و محبت کی جیتی جاگتی آٹھ تصویریں" بھی پیش کی ہیں۔ اور اس طرح آٹھ مقتدر اور بڑے آدمیوں کی داستان محبت سنا کر قاری کے ذہن سے اپنے واقعہ کو بھلانا چاہا ہے۔ دوسروں کی داستانیں سناتے وقت انھوں نے بڑا رنگین اور پر لطف طرز بیان اختیار کیا ہے ان کے قلم کی روانی قابل ذکر ہے اب نہ مشہور شعراء کے اشعار کی سند ہے اور نہ عشق و محبت کے بارے میں فلسفہ بگھارا ہے۔ کاش اپنا قصہ بھی اسی طرح لکھ دیا ہوتا۔

ان کی یہ بات کچھ قابل اعتراض سی معلوم ہوتی ہے اگر انھوں

نے جرأت اظہار کو اپنا شیوہ بنایا تھا تو پھر بے باکی اور جرأت سے کام کبھی لیا ہونا۔

اپنی اولاد کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اپنی اولاد سے نہ صرف محبت ہے بلکہ اس کو قدر کی نگاہ سے بھی دیکھتے ہیں۔ ان کے اور ان کی اولاد کے تعلقات قابل رشک حد تک خوشگوار ہیں یہاں تک کہ انھوں نے عقد ثانی بھی اپنے بیٹے اور بیٹی کی اجازت اور خوشی سے ہی کیا۔ اردو شاعری اور اردو ادب کے متعلق اظہار خیال اس طرح کیا ہے کہ وہ اپنی جگہ ایک مختصر مضمون کہا جا سکتا ہے تاہم اس سے ان کے خیالات اور نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مجموعی طور پر اعمالنامہ اردو کی قابل تعریف آپ بیتی ہے۔ جس میں ملک کی خصوصاً مسلمانوں کی سیاست کا بسیط جائزہ لیا گیا ہے۔ اور آپ بیتی کا بھی خاصا حصہ اسی میں آگیا ہے: تذکرہ ابوالکلام آزاد کا تذکرہ کہنا محض خوش فہمی ہے۔ اور اس کا مولانا کی ذات سے تعلق فقط اسی قدر ہے کہ تذکرے کے مولف نے اسی ارادہ سے کہ مولانا کے خود نوشت سوانح حیات مرتب کریں مولانا کو مجبور کیا کہ وقتاً فوقتاً اپنے حالات اور سوانحات تحریر کر کے ان کو دیتے رہا کریں لیکن مولانا کے تجاہل عارفانہ کو تو دیکھئے کہ ان کے بہم تقاضوں اور اصرار کے بعد لکھ کر دیتے تھے تو کیا اپنے اجداد کا تذکرہ علمار سوء کی افسوسناک حرکات پر تبصرہ عہد اکبری کے علمار کی چشمکیں رنجشیں حرص و مفسدہ پردازیاں

اور اپنے اجداد کا اس تمام ہنگامہ اور شور و شر سے دامن بچانا وغیرہ آخر میں بد قت تمام خود اپنے متعلق بھی چند صفحے تحریر کئے ہیں۔ جن سے زیادہ غبار خاطر کے صفحات میں ان کی شخصیت کی جھلک نظر آتی ہے اس کو آپ بیتی کہنے کی بجائے اگر ہم یہ کہدیں کہ یہ آپ بیتی کے ایک مختصر پہلو کا شاعرانہ بیان ہے تو شاید غلط نہ ہوگا ع

مختصر حال جسم و دل ہے | اس کو آرام نا اسکو خواب نہیں

یا بقول حسرت موہانی :- عاشق ہوئے اور مر مٹے ہم اپنی تو یہ مختصر ہے روداد

بس تذکرہ میں آپ بیتی کی قدر ہے ایک مختصری آپ بیتی تو کیا چند واقعات زندگی حکیم احمد شجاع نے بھی لکھے ہیں۔ "خون بہا" بظاہر تو اچھی خاصی ضخیم کتاب ہے لیکن آدھے حصہ میں اپنے افکار نظم و نثر اور تخیلات درج کر دیئے اور اس کے بعد "پچھلے پچاس برس" کے عنوان سے اپنے حالات زندگی ضبط تحریر میں لائے ہیں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی بنیاد انکساری اور محبت پر رکھی گئی ہے۔ مصنف محبت کا ایک ایسا ٹھنڈا میٹھا اور فرحت بخش چشمہ ہے جس کی فیض رسانی ہر کس و ناکس کے لئے عام ہے وہ ایک محبت کرنے والا باپ شفیق استاد گرم جوش دوست اور بڑا سعید شاگرد ہے۔ انھوں نے اگر اپنی مشاہدات اور تصورات کی یہ دنیا جسے پچاس برس کی محنت سے بسایا ہے اپنے بچوں کے ناموں سے منسوب کی ہے تو وہ اپنے پہلے اور آخری شاگرد سردار سر محمد نواز خاں کو بھی نہیں بھولے

اسی طرح وہ اپنے حالات اپنے لئے بیان نہیں کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس
میں خاص اپنے شخصی حالات بال بچوں اور متاہل زندگی اپنی ملازمت یا ادبی
خدمات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بلکہ اپنے حالات کے ساتھ اپنے بزرگوں
استادوں اور دوستوں کی یاد تازہ کرنا چاہی ہے تعارف میں لکھتے ہیں

"اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں بہت اجمال کے
ساتھ وہ حالات اور واقعات بیان کردوں جن کی سیل
رواں کے ساتھ ساتھ میں اپنی عمر کے گزرے ہوئے زمانے
میں بہتا چلا آیا ہوں۔ ان حالات کے بیان سے یہ مقصود
نہیں کہ میں کسی ذاتی اہمیت یا شخصی توقیت کے اظہار کے
لئے بہانہ تلاش کروں۔ مدعا فقط یہ ہے کہ اس سلسلے میں
ان نامور بزرگوں کا بھی ذکر کیا جائے جن کے فیض صحبت
سے ازلی مناسبت کو اکتسابات دانش کی سعادت میسر آئی

(تعارف صفحہ۔ اخون بہام)

اس کے علاوہ ان کا مطمح نظر یہ بھی تھا کہ اپنے بعض دوستوں کی
زندگی کے بعض دلچسپ اور درخشاں پہلو بھی پیش کر دیں۔

"پچھلے پچاس برس کی یہ سرگزشت اس لحاظ سے ایک قیمتی یادداشت
ہے کہ اس میں ضمناً ان لوگوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا
تذکرہ ہے جن کے کارناموں کی درخشانی سے ہندوستان
کی قومی مجلس اور سیاسی تاریخ کے اوراق منور ہیں۔"

(تعارف صفحہ ۱۰ خون بہا)

غرض یہ کہ ان کی نظر میں اپنی زندگی سے زیادہ دوسروں کی زندگی کی وقعت ہے اور ان کا محبت بھرا دل ان سب کی یاد سے معمور ہے در اصل مبارک ہے وہ زندگی جو دوسروں کو ہدیہ محبت دے سکے۔ عجیب بات ہے کہ ان دو سو اڑسٹھ (۲۶۸) صفحات میں حکیم احمد شجاع کے قلم سے ایک لفظ بھی ایسا نہ نکل سکا جس میں کسی کی تحقیر یا تمسخر کا پہلو نکلتا ہو۔ انھوں نے اپنے اتنے وسیع حلقہ شناسائی میں کسی کے لئے کبھی کوئی سخت یا بُرا الفاظ استعمال نہیں کیا۔ اپنے عزیزوں رشتہ داروں نوکروں دوستوں۔ استادوں یا شہروں فضاؤں اور اس ماحول تک کو جس میں سازگاریوں اور ناسازگاریوں سب ہی سے دو چار رہے ہوں گے نہ صرف ذکر خیر سے یاد کیا ہے۔ بلکہ اتنے پیار سے اور دلکش انداز میں ان کا ذکر کیا ہے کہ قاری کے دل میں بھی ان سب کے لئے محبت کا مخلص اور بے پناہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اپنے وطن اور عزیزوں کی محبت بھری آغوش سے نکل کر علی گڑھ پہنچتے ہیں تو وہاں کے ہر متنفس اور ہر ذرے سے محبت کرنے لگتے ہیں ڈاکٹر ضیاء الدین جن کی بعض کمزوریوں کا ذکر اکثر بہت مزے لے لے کر کیا جاتا ہے۔ ان کی بعض ناقابل فراموش خدمات اور تدبر کا ذکر بھی اس طرح کیا ہے کہ معترضین کے اعتراضات اور الزامات کے باوجود ان کی قدر دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کا ذکر قدر و محبت

سے کرتے تو عجب نہیں لیکن وہ تو اسی محنت سے احمد بخش حجام اور
سوہن لال پوسٹ مین کا بھی کرتے ہیں۔

"احمد بخش حجام جنہیں سرسید کے بال اور ناخن تراشنے کا فخر
حاصل تھا۔ اب بھی اپنے اصلاحی کام میں بڑی چابک دستی
سے مصروف رہتے تھے۔ جب وہ میرا خط بنانے آتے
تو خط بناتے بناتے ان اولڈ بوائز کی ساری داستان
حیات سناتے جاتے تھے۔

(خون بہا صفحہ ۲۲۶)

اسی طرح سوہن لال پوسٹ مین کے جذبات کا ذکر کتنی اچھی
طرح کیا ہے۔

سوہن لال پوسٹ مین جب کبھی کسی اولڈ بوائے کو سرسید
کورٹ میں دیکھ پاتا تو اسے اس کے نام ہی سے
پکارتا۔ ظفر میاں احسان میاں آپ کا کوئی خط نہیں کل
آئے گا۔ خدا جانے وہ ان اولڈ بوائز کو دیکھ کر پرانے
زمانے میں زندگی بسر کرنے لگتا تھا یا اس کا ذکر ذہن
اس حقیقت کو سمجھنے سے انکار کر دیتا تھا۔ کہ یہ اولڈ بوائز اب
وہ لڑکے نہیں جنہیں سوہن لال جانتا تھا۔"

(خون بہا صفحہ ۲۲۷)

پھر اس محبت بھرے دل کی انسیت اور لگاؤ کی حد تو دیکھیے

کہ اب بھی ہم لوگ جب کالج میں جاتے ہیں تو سر سید کورٹ کے برآمدے میں احمد بخش کے ریزر بنیز کرتے کی کھٹ کھٹ اور سوہن لال کے کھڑی والے جوتے کی کھٹ کھٹ سنائی دیتی ہے۔"

(خون بہا صفحہ ۲۲۷)

علی گڑھ ہو یا میرٹھ کالج اور وہاں کا اسٹاف لڑکے ہوں یا ملازم ہر ایک کا ذکر محبت سے کرتے ہیں۔ کسی کے کیسے ہی نظریئے ہوں کچھ ہی طریقے ہوں ان کو کوئی سروکار نہیں۔ وہ تو فرد اور اس کی ذات کے متوالے ہیں۔ ان کی نظر میں نواب صاحب بھوپال۔ شفقت۔ امیر احمد ظہیر زاہدی غرضیکہ ہر شخص یکساں طور پر عزیز ہے مسعود نامی کی دلچسپ اور شہرہ آفاق شرارتوں کے مفصل ذکر کی وجہ بتاتے ہیں کہ

"مسعود کی روح جنت الفردوس کی آسودگی میں اس درد سے تڑپ نہ اٹھے کہ ہم اسے اتنی جلدی بھول گئے۔"

(خون بہا صفحہ ۳۰۸)

ان سطور میں ایک بچھڑے ہوئے ساتھی کے لئے کتنا پیار ہے اور اس کی جدائی کا کتنا شدید احساس۔

ظہیر زاہدی اور ان کے والد کی محبت کا ذکر اور پھر ان کی موت پر لکھنا کہ آج نہ تو وہ خود زندہ ہیں نہ ظہیر زاہدی کا ہی اس دنیا میں موجود ہے ورنہ وہ دیکھ لیتے کہ میں ان

کی محبت اور مروت کو آج تک بھولا نہیں۔ پنڈت کا کوچہ
ہمارے لئے ان کے دم سے آباد تھا۔ وہ گئے تو اس
کوچہ میں ہمارا آنا جانا بھی گیا۔ ہر صبح و شام ٹرام میں
بیٹھ کر پنڈت کے کوچے کا ٹکٹ لینا اب ایک بھولی ہوئی
کہانی ہے۔"

(صفحہ ۱۸۳ خوں بہا)

اسی طرح آفتاب منزل کا جانا اور آنا پھر سہا صاحب اور خورشید
احمد خاں کے جانے کے بعد وہاں ان کے لئے دلکشی کا ختم ہو جانا یہ
سب ایک محبت بھرے دل کی داستان نہیں تو کیا ہے۔

یہ تمام ذکر محض ان لوگوں ہی کی ذات پاک تک محدود نہیں رہتے ہیں
بلکہ اس سے خود ان کی شخصیت اور مزاج پر روشنی پڑتی ہے۔

حکیم احمد شجاع کے انداز بیان میں ایک خاص معصومیت اور
بھولاپن پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور بعض بظاہر مضحکہ خیز
حرکات کو بڑی سادگی سے بیان کر جاتے ہیں اس بیان کا انداز یہ
نہیں ہے کہ یہ میری کمزوریاں ہیں اور مجھکو تمہارے سامنے جارحانہ
پیش کرنا ہے۔ بلکہ ان کا انداز کچھ اس طرح کا ہوتا ہے ہاں کبھی ہم
نے یہ بھی کیا تھا۔ چنانچہ افتدو دانی کا انداز ہے۔ مثلاً میرٹھ کالج کے
فلاسفی کے پروفیسر بابو نند لال کی صحبت اور نصیحتوں سے متاثر ہو کر
فرقہ ملنگیہ کا قائم کرنا اور عجیب و غریب حرکات کرنا مثلاً۔

"میرے کمرے کا فرش سیاہ ڈمبر سے ہیئت پرستی تھی۔ کمرے کے سنٹل پیس پر ایک کاسہ سر رکھا تھا۔

(صفحہ ۳۶۱ خوں بہا)

اور پھر اس کاسہ سر کی طرف گیان دھیان سے ٹکٹکی لگا کر دیکھنا اور اس میں کلو پیٹرا کا حسن وشوا متر کا جلال افلاطون ارسطو نبرد وغیرہ کی فراست ہیبت اور سخاوت دیکھنا غرض ان تمام دلچسپ اور مضحکہ خیز حرکات کا ذکر کرنا اور پھر اس کا بھی بڑی معصومیت سے اقرار کرنا کہ

"میں میرٹھ رہتا تو ممکن تھا کہ پیروؤں کا حلقہ بہت وسیع ہو جاتا اور فرقہ ملنگیہ بھی ہندوستان کے کئی خود رو اور باطل پرست فرقوں کی طرح خدا کے قائم کئے ہوئے نظام میں اختلال کا باعث ہوتا۔"

(صفحہ ۳۶۳)

ساتھ ہی یہ اقرار کیا ہے کہ میرے جاتے ہی وہ خانہ باطل گر گیا مگر میرے پیرو مدت تک میری راہ دیکھتے رہے اس سے بھی زیادہ اپنی نیماہیڑے کے سرکاری ریسٹ ہاوس والی مضحکہ خیز حرکت کا ذکر یعنی بنے ہوئے شاہ صاحب کے جن اتارنے پر ایمان لانا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی ان کا معتقد بنانا اور پھر ان کی شاگردی کرنا حتی کہ

"شاہ صاحب نے باطل کا وہ طلسم خود ہی توڑنا شروع

کردیا باریک بالوں کا لمبا تار بنا لو اس کے ایک
کنارے پہ ذراسی موم لگالو وغیرہ وغیرہ
(صفحہ ۱۷۳ خوں بہا)

اور پھر وہی سادگی کہ
"میں سوچ رہا تھا کہ انسان سے زیادہ بے وقوف
کوئی حیوان نہیں اور سمجھ رہا تھا کہ شاہ صاحب اب
بھی مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔"
(صفحہ ۱۸۷ خوں بہا)

اپنے لڑکپن کے لاابالی پن دارفتگی اور جوش کا ذکر اس طرح
کرتے ہیں۔

"حاصل کلام یہ کہ اس زمانے میں بزرگوں کی خرد افروز
صحبتوں کے ساتھ ساتھ جوانی کے ناعاقبت اندیش ہنگامے
بھی برابر جاری رہے ممتاز حسن ظہیر زاہدی شمس الاسلام
حیدر حسن ضیاء الحق اور میں دہلی اور میرٹھ کی گلیوں کو زندگی
کی دلفریب وادیاں سمجھ کر ان میں برسوں گرم سیر رہے
کبھی یہ وادیاں سرسبز اور شاداب میدانوں میں جا نکلیں
اور کبھی خم در خم دشوار گذار گھاٹیوں نے ہمارا خیر مقدم
کیا قدم قدم پہ پاؤں پھسلے اور سنبھلے"
(صفحہ ۳۰۹ خون بہا)

حکیم احمد شجاع صاحب کی تحریر بڑی صاف شستہ اور دل نشین ہے۔ ساتھ ہی خلوص سادگی اور سب سے زیادہ اس کی روح محبت نے اسکو ایک خاص سادگی۔ دلکشی اور حسن دے دیا ہے۔ ان کی داستان حیات کے یہ چند پہلو بڑے دلچسپ ہیں۔ انھوں نے علی گڑھ کی زندگی اور وہاں کی مخصوص روایتوں کا ذکر بڑے شوق و محبت سے کیا ہے لیکن ان کا انداز رشید احمد صدیقی سے مختلف ہے وہ اپنی تحریر میں مقامی رنگ کچھ اس طرح دیتے ہیں کہ اس سے مقامی لوگ ہی محظوظ ہو سکتے ہیں اور جو علی گڑھ کے ماحول اور فضا سے ناواقف ہوں۔ وہ اس سے خاطر خواہ طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتے" لیکن انھوں نے کچھ ایسا سیدھا سادہ پیرایہ اختیار کیا ہے کہ۔ ہر شخص اس زندگی کی جھلکیاں دیکھ سکتا ہے جو وہاں گزار چکے ہیں۔

تذکرہ آپ بیتیوں کے علاوہ اردو میں کوئی قابل ذکر آپ بیتی نظر نہیں آتی اور اردو زبان حیات انسانی کے اس دلچسپ اور اہم ترین موضوع سے تقریباً تہی دامن ہے بہ حقیقت میں کسی زبان کی بد قسمتی ہے کہ وہ انسان کے اپنے تجربات واردات جذبات اور سوانحات کی خود نوشت داستانوں سے خالی ہو۔

شکر کہ ایں نامہ بعنوان رشید
بیشتر از مرگ بپایاں رسید

الطاف فاطمہ

زیرِ طبع

پیامِ مشرق ، مع شرح - پروفیسر یوسف سلیم چشتی جلد اوّل -/۲۵
جلد دوم -/۲۵

یادِ اقبال ، پروفیسر یوسف سلیم چشتی -/۱۵

اگست ۱۹۷۷ء کے آخر میں آنے والی ہی کتاب

مومن اور مطالعہ مومن ڈاکٹر عبادت بریلوی
کلاں سائز پر اول دوم مجلد

ہماری معیاری کتب

مقدماتِ عبدالحق	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۶۰/-
تعلیماتِ اقبال، کلاں سائز،	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۲۰/-
کلیاتِ اقبال، فارسی،		۲۵/-
کلیاتِ اقبال، اردو،		۹/-
جاوید نامہ، مع شرح، کلاں سائز۔	پروفیسر یوسف سلیم چشتی جلد اول	۶۰/-
〃 〃	〃 〃 جلد دوم	۴۰/-
رموزِ بیخودی، مع شرح،	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۱۵/-
ارمغان حجاز 〃	〃 〃 〃	۸/-
شرح بانگ درا	〃 〃	۱۴/-
شرح بال جبریل	〃 〃	۱۴/-
شرح ضربِ کلیم	〃 〃	۱۲/-
شرح دیوان غالب	〃 〃	۳۰/-
انور	منشی فیاض علی	۲۰/-
خدا کی بستی	شوکت صدیقی	۱۵/-
زیور	اے۔ آر خاتون	۳۰/-

اسلام منزل بہ منزل	ترجمہ رئیس احمد جعفری	۱۵/-
حقوق القرآن	مولانا اشرف علی تھانوی	۵/-
حضرت عمر فاروق	مولانا اعجاز اعظمی	۲/۵۰
تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات	ڈاکٹر عبدالوہاب ظہوری	۸/۵۰
منٹو کے ادبی مضامین	سعادت حسن منٹو	۸/۵۰
اردو میں ڈرامہ نگاری	بادشاہ حسین	۸/-
دستِ صبا	فیض احمد فیض	۳/-
صلیبیں مرے دریچے میں	" "	۱۵/-
غالب کے رومان	عارف بٹالوی	۷/-
اقبال ادیبوں کی نظر میں	ظفر اقبال	۵/-
جدید شاعری	عبادت بریلوی	۲۵/-
نیا افسانہ	وقار عظیم	۹/-
تصوراتِ اقبال	مولانا صلاح الدین احمد	۱۲/۵۰
غزل اور مطالعۂ غزل	عبادت بریلوی	۲۵/-
آبِ حیات	محمد حسین آزاد	۱۲/-
زادِ راہ	منشی پریم چند	۶/۵۰
داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	۱۲/-
دشمنِ دامن	سلمیٰ کنول	۱۲/-
امانت	"	۷/۵۰

شگوفے چٹکے	حمیدہ جبیں	۱۱/-

مریم	رضیہ بٹ	۱۰/-
شمس و قمر	"	۵/۵۰
قواعدِ اردو	ڈاکٹر عبداللہ	۸/-
کلیاتِ جگر	جگر مرادآبادی	۱۲/-
کلیاتِ شکیل	شکیل بدایونی	۸/-
اندازِ بیان اور	راجہ مہدی علی	۶/-
تاریخ عرب	سر سید احمد خاں	۷/۵۰

عزیمت و دعوت	مولانا آزاد	۳/۷۵
غبارِ خاطر	"	۱۲/-
تاریخ زبانِ اردو	شمس انصاری	۴/۵۰
لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۲۰/-
میر اور میریات	ڈاکٹر صفدر آہ	۱۵/-
شام و سحر	چندر موہن	۸/-
دو آتشہ	"	۸/-
شعر و نغمات	فیاض احمد فیاض	۸/-
تاج الحقائق	ڈاکٹر نور السعید	۱۰/-

دل کا کیا رنگ کروں	ایم۔ اے جاوید	۲/۵۰
غمِ فرقت	ذکیہ بیگم	۸/-
درندہ	اظہار اثر	۳/۵۰
چار شیطان	"	۳/-
فریب ویمپائر	عظیم بیگ چغتائی	۳/۵۰
بھرم	عشرت کرتپوری	۴/-
ابو مسلم خراسانی	صادق سردھنوی	۸/-
صلیبی جہاد	"	۹/-
آخری چٹان	نسیم حجازی	۱۰/-

مباحث	ڈاکٹر سید عبداللہ	۲۵/-
نقدِ میر	"	۱۰/-
غالب	ڈاکٹر سید عبداللطیف	۵/۰۰
حیاتِ غالب	ڈاکٹر محمد اکرام	۵/-
تمدنِ ہند	سید سلیمان ندوی	۲۰/-

تصوف کی کتابیں بھی ہمارے یہاں ملتی ہیں۔ فہرست کتب طلب فرما سکتے ہیں:۔